نغمۂ کوہسار

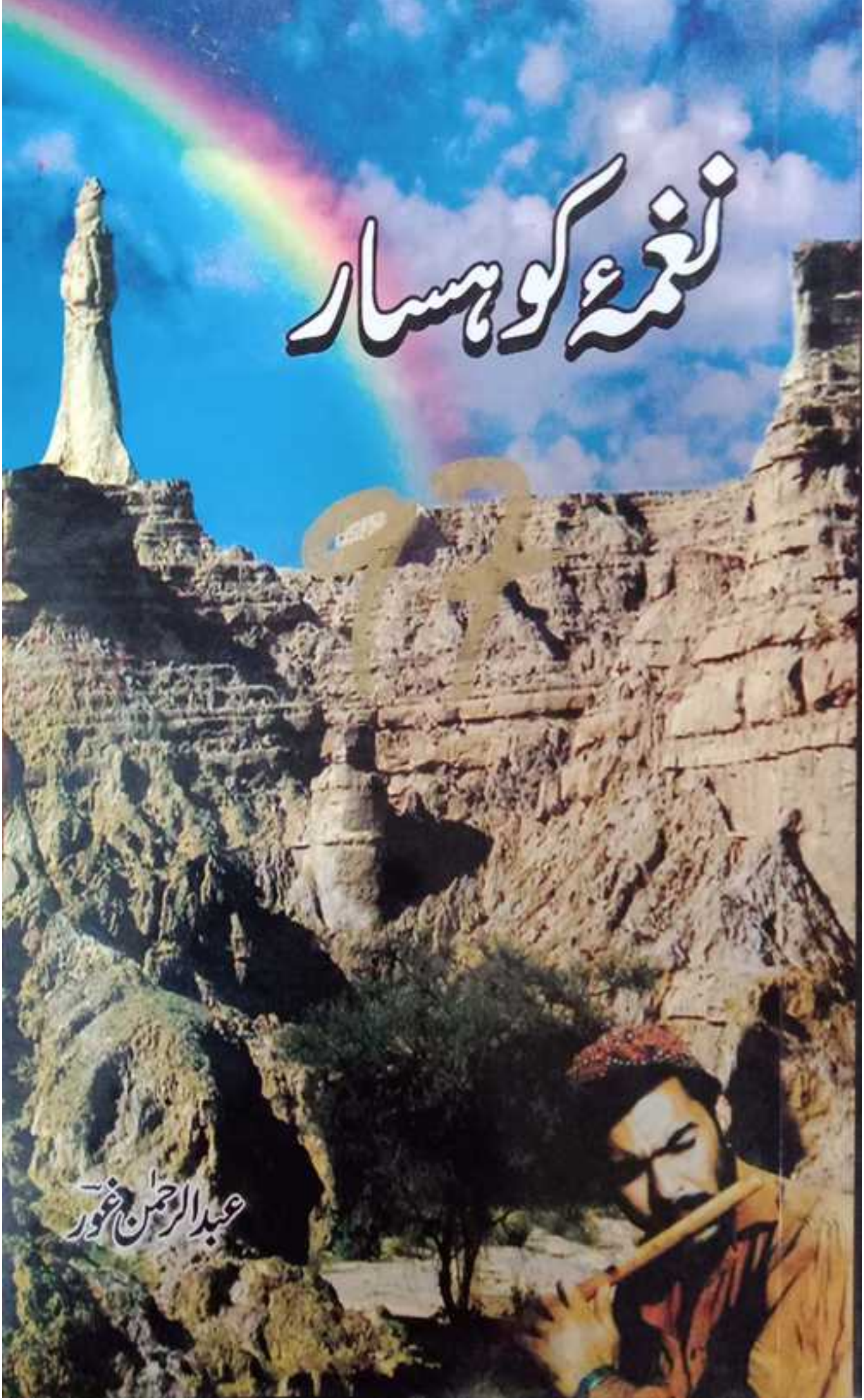

عبدالرحمٰن غور

نغمۂ کوہسار

بلوچی زبان کے قدیم شعراء و ادباء کے حالات اور نمونہ کلام

عبدالرحمٰن غورؔ

بلوچی اکیڈمی کوئٹہ

© بلوچی اکیڈمی کوئٹہ

کتاب ءِ نام	:	نغمۂ کوہسار
مصنف	:	عبدالرحمٰن غور
پروف ریڈر	:	محمد پناہ بلوچ
ڈیزائننگ	:	بہرگ بلوچ
کمپیوٹر کمپوزر	:	نذر بلوچ
پرنٹرز	:	یونائیٹڈ پرنٹرز کوئٹہ
بار اوّل	:	1968ء
بار دوئم	:	2013ء
تعداد	:	500
قیمت	:	300/= کلدار

ISBN: 978-969-9768-02-6

انتساب

بلوچی اکیڈمی کوئٹہ اور بلوچستان کی اُن عظیم
ہستیوں کے نام جن کے کارہائے نمایاں ہماری
آنے والی نسلوں کے لئے مشعلِ راہ ہیں!

(عبدالرحمٰن غور)

فہرست

نمبر شمار	عنوان	صفحہ نمبر
1	تعارف، ملک محمد رمضان بلوچ	11
2	پیش لفظ	13
3	بلوچوں کی تاریخ اور اُن کا ادب	15
4	شہہ مُرید	34
5	بیبرگ	44
6	میران رند	54
7	جام دُرّک	61
8	مُلّا فاضل رندؒ	85
9	عزت پنجگوری	91

10	بالاق	95
11	مہتاز	108
12	غلام محمد بالاچانی	116
13	سیمک	124
14	رحم علی مری	132
15	توکلی مست	143
16	جمعہ کلوانی	157
17	تاجل	162
18	مولانا محمد فاضل درخانیؒ	172
19	مولوی حضور بخشؒ	179
20	سہنا بخش علی	183
21	محمد خان مری	191
22	قاضی نور محمد گنج آبویؒ	197
23	ملا بہرام	204
24	فقیر قیصر خان	209
25	فقیر فیصل	214
26	جواں سال	217

تعارف

زیرِ نظر کتاب ''نغمہءِ کوہسار'' بلوچستان کے مشہور ادیب، شاعر اور کہنہ مشق صحافی جناب عبدالرحمٰن صاحب غوؔر کی سالہا سال کی تحقیقی کاوشوں کی مرہون منت ہے، مصنف نے اس کتاب میں شامل بلوچی زبان کے جن معروف شعراء کو پیش کیا ہے، اور ان کے کلام کے ساتھ ان کی زندگی کے حالات جمع کرنے میں جن جگر کاویوں سے کام لیا ہے، وہ ہر اعتبار سے قابلِ قدر ہے۔

زیرِ نظر کتاب پندرھویں صدی عیسوی سے لے کر دورِ حاضر کے نامور شعراء کے کلام، بیان اور حالاتِ زندگی پر مشتمل ہے، مصنف نے واضح دلائل کے ساتھ، ہر شاعر کے عہد، اس عہد کے ادبی رجحانات اور اس کی مقصدیت پر گفت گو کی ہے، اور مسکت دلائل کے ساتھ یہ ثابت کیا ہے، کہ پندرھویں صدی عیسوی سے لے کر عصرِ حاضر کے شاعر تک سب میں حیرت انگیز حد تک فکری و نظری ہم آہنگی پائی جاتی ہے، اور مقصدیت

کے اعتبار سے ہر دور کی بلوچی شاعری ایک دوسرے کے ساتھ اس حد تک مماثلت و یگانگت کی حامل ہے، جس سے بلوچی شاعری کی مستقل افادیت کا اعتراف کرنا پڑتا ہے۔

بلوچی شاعری کو ملک کی دوسری علاقائی زبانوں کی شاعری سے جو چیز ممیز کرتی ہے، وہ بلوچ شعراء کی حقیقت پسندی کے ساتھ روایتی وابستگی ہے، جو ان کا شروع سے شعار رہا ہے۔

مصنف نے بعض شعراء کے کلام کو منظوم اُردو ترجمہ کی مدد سے بھی قارئین سے روشناس کرانے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ کہیں کہیں نثری ترجمہ بھی دیکھنے میں آتا ہے، لیکن اس قسم کے غیر منظوم ترجمہ میں بھی مصنف نے شاعر کے مجموعی تاثر کو پیش کرنے کی سعی کی، بلکہ اس میدان میں بھی اپنی فنی صلاحیتوں کا کامیاب مظاہرہ کیا ہے، اور ایسا کر کے انہوں نے بلوچی ادبیات پر کام کرنے والوں کے لئے ایک قابلِ تقلید مثال قائم کی ہے۔

نغمہ ءِ کوہسار، بلوچی تصانیف کے علاوہ بلوچی اکیڈمی کوئٹہ کی چوتھی اُردو پیشکش ہے، بلوچی اکیڈمی اور اس کے رجالِ کار کو یقین ہے، کہ اس کتاب کے مطالعہ سے غیر بلوچی دانشوروں کو بلوچی ادبیات کی افادیت، مقصدیت، اسلوب بیان کی تکنیک اور اس کی شعری اہمیت کو جاننے میں مدد ملے گی۔

جنرل سیکرٹری
بلوچی اکیڈمی کوئٹہ

کوئٹہ۔ ۲ دسمبر ۱۹۶۷ء

پیش لفظ

یہ آج سے قریباً آٹھ سال پہلے کی بات ہے۔ میں نے محسوس کیا کہ بلوچی زبان کے قدیم شعراء وادباء پر تحقیق کا کام نہیں ہوا اور اگر ہوا ہے تو وہ، نہ ہونے کے برابر ہے۔ کیونکہ میں نے جب اس سلسلے میں کوشش کی تو بہت سی دشواریاں پیش آئیں اور وہ یُوں کہ اگر کسی شاعر کے حالات زندگی ملے۔ تو نمونہ کلام نہ ملا۔ اسی طرح سن پیدائش ووفات اور جائے قیام کے متعلق بھی صحیح معلومات حاصل نہ ہوسکیں، بہر کیف مجھ سے جس قدر ہوسکا۔ قدیم بلوچ ادباء وشعراء کے حالات زندگی اور نمونہ کلام حاصل کرکے، اُسے ایک مجموعہ کی شکل میں مرتب کیا جو ''نغمہ کوہسار'' کے نام سے پیش خدمت ہے۔

بلوچی زبان وادب سے تعلق رکھنے والے حضرات، یہ بخوبی جانتے ہیں کہ قدیم بلوچی ادب کبھی حیطہ تحریر میں نہ آسکا۔ کیونکہ اس وقت بلوچی رسم الخط کا تعین نہ ہوسکا تھا ۔دوسرے لفظوں میں یوں سمجھئے کہ ہیئت تحریر کا رواج نہ تھا۔ ہم تک جو کچھ پہنچا ہے، وہ

سینے کا علم ہے جو پشت در پشت اور سینہ بہ سینہ منتقل ہوتا رہا اور آج بھی بلوچی
کا گرانقدر سرمایہ یہی ہے۔

بلوچی زبان کے قدیم شعراء وادباء کے سوانح حیات اور نمونہ کلام
حصول کے لئے اپنے طور پر میں نے جو کوشش کی ہے، وہ اسی سینے کے علم کا مرہون منت
ہے۔ ان میں سے بعض کے حالات زندگی صحیح طور پر نہ ملے اور بعض کی تاریخ پیدائش
ووفات اور جائے سکونت کا پتہ نہ لگ سکا۔ اس کے لئے میں معذرت خواہ ہوں، تحقیق کا
سلسلہ جاری ہے۔ توقع ہے کہ آئندہ ایڈیشن میں اس کمی کو پورا کیا جائے گا۔

یاد رہے کہ اُس وقت بلوچی زبان وادب پر اس بارے میں بلوچی روایات اور
انگریزی کتب کے علاوہ بلوچی اور اُردو میں کوئی کتاب شائع نہیں ہوئی تھی۔ قدیم بلوچی
شاعری، سرمستِ بلوچستان اور دیگر چند کتب حال ہی میں شائع ہوئی ہیں۔ میں نے "نغمہ
کوہسار" میں قدیم شعراء ادباء پر جو کچھ لکھا ہے۔ وہ بلوچی زبان کے پُرانے بہی خواہوں
اور بڑے بوڑھے بلوچوں سے پوچھ پاچھ کر لکھا ہے۔ ہوسکتا ہے کہ اس میں کہیں کوئی کمی
رہ گئی ہو، لیکن میں نے اپنی طرف سے تحقیق کے سلسلے میں کوئی کمی نہیں چھوڑی، مجھے یقین
ہے کہ میری اس کاوش کو سراہا جائے گا۔ آخر میں میرے لئے یہ کہنا ضروری ہے کہ بلوچی
اکیڈمی کوئٹہ شکریہ کی مستحق ہے کہ اس نے میری اس کاوش کو شرف قبولیت بخشا۔

عبدالرحمٰن غور
ہدہ، کوئٹہ

28 اگست 1966ء

بلوچوں کی تاریخ اور اُن کا ادب

بلوچ قوم کی تاریخ اور ادب کے سلسلے میں سب سے پہلے یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ بلوچ کس نسل سے ہیں اور ان کا اصلی وطن کون سا ہے؟ کیونکہ یہ اصول ہے کہ کسی قوم کی تاریخی تحقیق کے سلسلے میں حسب نسب اور وطن کے متعلق معلومات حاصل کرنا ہی سب سے پہلا اور ضروری کام ہے۔ اس کے بعد اس قوم کی تاریخ، ادب اور ثقافت پر تفصیل سے لکھا جاسکتا ہے۔ لہٰذا بلوچوں کے حسب نسب اور جائے خروج کے سلسلے میں پہلے اس امر کی تحقیق ضروری ہے کہ بلوچ کون ہیں اور کہاں سے آئے؟ اسے یہاں دو ادوار قدیم وجدید میں پیش کیا جاسکتا ہے۔ قدیم تحقیق کے ماخذ یہ ہیں:

حسب ونسب:

بلوچوں کے متعلق خود ان کے اپنے شعراء، وادباء کے علاوہ علم الانساب کے ماہر انگریز مورخین نے بھی تحقیق کی ہے لیکن ان سب کی آراء میں اختلاف ہے۔ کوئی انہیں ایرانی النسل قرار دیتا ہے تو کوئی ترکمان نسل سے ملاتا ہے۔ اور بعض انہیں عربی النسل قرار دیتے ہیں۔ صحیح تحقیق ابھی تک نہیں ہوسکی کیونکہ اس قوم کے قدیم واقعات اور قومی وقبائلی روایات کے علاوہ بلوچی اشعار (نظمیں وغیرہ) ہی تاریخی سرمایہ ہیں۔ ان میں بھی کافی خامیاں ہیں، کیونکہ بیشتر واقعات وروایات جو اکثر اشعار میں ہیں۔ حقائق کی بجائے شاعرانہ مبالغہ آرائی زیادہ ہے صحیح تاریخی حقائق ناپید ہیں اور اس کی شکایت اکثر مورخین کو رہی ہے۔ یہاں تک کہ بلوچستان کے ایک بلوچ مورخ میر گل خان نصیر نے بھی اپنی تالیف ''تاریخ بلوچستان'' میں تاریخی شواہد اور حقائق کی عدم موجودگی کے بارے میں ایک جگہ لکھا ہے:

''بلوچستان اور بالخصوص بلوچ قوم کی صحیح تاریخ پیش کرنے کے لئے جن تاریخی شواہد اور داخلی مواد کی ضرورت ہے۔ ان کا بلوچستان میں سرے سے وجود ہی نہیں۔ ہمارے قومی اور ملی آثار جن سے اس فن میں خاطر خواہ مدد مل سکتی ہے۔ نہ ہونے کے برابر ہیں اور یہ ایک نہایت ہی افسوسناک اور حوصلہ شکن حقیقت ہے کہ ایک طویل کدوکاوش اور تجسس وجستجو کے باوجود مجھے اب تک کوئی ایسی تاریخ نہیں ملی، جو کسی بلوچستانی یا بلوچ کی لکھی ہوئی ہو کوئی ایسا تاریخی مواد دستیاب نہیں ہوا، جس کی صحت پر شک نہ کیا جاسکے''۔

بلوچوں کے حسب نسب کے متعلق تحقیقات اور ان کی تاریخ پر کافی روشنی ڈالی گئی چنانچہ ہتورام نے سنڈیمن کے ایماء پر اس کے روزنامچہ میں سے بلوچی قبائل کے حالات اور دیگر تاریخی مواد جمع کر کے ''تاریخ بلوچستان'' کے نام سے ایک کتاب شائع کی۔ اس کے علاوہ انگریزی فوجی اور سول افسروں' انگریز سیاحوں کے سفرنامے اور سوانح عمریاں بھی ایسی نامکمل تصانیف ہیں۔ جن سے بلوچی تاریخ سے متعلق تو کچھ مواد حاصل ہوسکتا ہے مگر بلوچوں کے حسب نسب کے متعلق ان میں مصدقہ طور پر کہیں ذکر نہیں ہے۔ لہٰذا ہمارے لئے اس کے سوا کوئی چارہ کار نہیں کہ ہم بلوچی حسب نسب کے بارے میں مقامی اور انگریز مورخین و محققین کی آراء کو اکٹھا کر کے تاریخی اصول وشواہد کی روشنی میں تفصیلی جائزہ لیں یقیناً کوئی موزوں حل نکل آئے گا۔

بلوچی حسب نسب کے متعلق اب تک علما لانساب کے جن انگریز محققین نے تحقیق کی ہے ان میں برٹن' لاسن اور ڈیمز نے بلوچوں کو ایرانی نسل قرار دیا ہے اور ادھر پوٹنگر اور خانیکاف نے اپنی تحقیق سے بلوچوں کو ترکمان نسل سے بتایا۔ مگر ان کے برعکس سرطامس ہالڈاک اور اس کے ہم عصر مورخین نے بلوچوں کو عربی النسل قرار دیا ہے۔ ان محققین نے اپنی تصانیف میں یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ بلوچ عرب سے ہجرت

کر کے پہلے پہل ایرانی سرحدوں پر آباد ہوگئے ۔بعدازاں کرمان۔سیستان اور مکران سے ہوتے ہوئے سندھ اور پنجاب تک پھیل گئے۔

ایرانی تہذیب وتمدن اور شجاعت کے کارناموں کی تاریخ ''شاہنامہ فردوسی'' میں ایک واقعہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ نوشیروان عادِل شاہ ایران کے زرّین عہد ۵۳۱ھ میں بلوچ کوہ البرز (جسے فردوسی نے برزکوہ لکھا ہے) کے گردونواح میں آباد تھے۔ ایک دفعہ ان کی تاخت سے ایرانی دہقان عاجز آ کر نوشیروان کے پاس فریادی گئے۔ اور بقولِ فردوسی نوشیروان خود ایک جرار سپاہ کے ساتھ بلوچوں کی سرکوبی کو نکلا اور ان پر فرار ہونے کے تمام راستے روک کر اس نے سپاہ کو ان کے قتل عام کا حکم دیا۔ ایرانی سپاہ کے قتل عام سے بلوچوں کے اس قبیلہ یا طائفہ کے جتنے افراد بچ کر نکلے، انہوں نے اپنے آبائی وطن کو ہمیشہ کیلئے خیر باد کہا۔

آگے چل کر تاریخوں میں اس طائفہ کے متعلق لکھا ہے کہ سردار میر قمبر خان کی سرکردگی میں بلوچوں کا یہ طائفہ سیستان، رودبار، چاغی اور خاران سے ہوتا ہوا ماراب، سیاہ کنب اور جھالاوان کے پہاڑوں میں آ کر رکا اور یہاں کے گردونواح میں آباد ہونا شروع ہوا۔ اور اس علاقے کو اپنا وطن بنایا اسی شاہنامہ فردوسی کے بعض اشعار سے تو اس بات کا بھی ثبوت ملتا ہے کہ ظہور اسلام سے پہلے بلوچ اقوام ایران میں موجود تھیں اور نہایت بہادر اور سرکش تھیں۔ اس وقت آنحضرت ﷺ کی ولادت باسعادت نہیں ہوئی تھی۔ جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ بلوچوں کا ایک طائفہ جو سب سے پہلے ایران میں پہنچا۔ عرب کے اسی نامور اور مقتدر قریش خاندان سے تھا۔ جو مدینہ سے ہجرت کر کے حلب میں مقیم ہوا اور بعدازاں نوشیرواں کے عہد میں ایرانی سرحدوں پر تبریز سے مشہد تک پھیل گیا۔ بلوچ لفظ کی وجہ تسمیہ بھی یہی بتائی جاتی ہے کہ حلب میں ایک ندی اور ایک پہاڑی بروچ کے نام سے مشہور ہے اور حلبی زبان میں اس لفظ کا اطلاق بادیہ نشینوں پر ہوتا ہے ۔ایک اور قدیم روایت ہے کہ ظہور اسلام سے قبل عرب میں ایک ''قوم'' بلوص'' کے نام

سے تھی جو بڑی جنگجو بہادر اور اس دور کی معزز قوم تھی۔ بعدازاں جب عرب کی سرزمین نور اسلام سے منور ہوئی تو اس قوم نے بھی اسلام قبول کرلیا۔ مگر یہاں دیکھنا یہ ہے کہ اس روایت میں جس قوم کو "بلوص" بتایا گیا ہے کیا یہ وہی بلوچ قوم ہے؟ جدید تحقیق کے مطابق ایک بلوچ محقق، جناب عبدالغفار خان بلوچ، بی اے، ایل ایل بی، ایڈووکیٹ اپنے ایک تحقیقی مقالہ "بلوچی حسب نسب پر ایک نظر" میں ایک جگہ اس لفظ کے متعلق لکھتے ہیں۔

"بیلوس" اس لفظ سے مورخین نے قیاس کیا کہ بلوچ لفظ کا ماخذ بیلوص ہے الجھاؤ کردیا۔ عربوں نے لفظ بلوچ کو عربی رسم الخط میں بیلوص کرکے لکھا۔ چونکہ بلوچ عرب سے آئے تھے۔ اس لئے گمان رہا کہ" بیلوص" اصلی وطن سے ساتھ لائے یعنی "بیلوص" لفظ بلوچ سے متقدم ہے حالانکہ یہ دوست نہیں۔ "بلوص" اور "بیلوس" ہم آواز ہونے کے سبب ایک ہی لفظ سمجھا گیا۔ یعنی ایک ہی لفظ دوصورتوں میں آیا بلوص عربی اور بیلوص اکادامی ہے۔

بلوچی حسب نسب کی تحقیق کے سلسلے میں مذکورہ قدیم روایت بھی جدید تحقیق کے ذریعے غلط ثابت ہورہی ہے۔ بلوچ عرب سے آئے یہ صحیح معلوم ہوتا ہے۔ مگر "بلوص" نام کی کوئی قوم "تاریخ عرب" میں نہیں ہے۔ "تاریخ بلوچستان" بھی بلوچ قوم سے متعلق صرف اتنا لکھا ہے:

بلوچ زمانہ قدیم سے آج تک ایشیاء میں ایک خانہ بدوش قوم چلی آئی ہے اور شاید جیسا کہ بعض مورخین کا خیال ہے۔ بلوچ کلی وجہ تسمیہ بھی خانہ بدوش اور بادیہ نشین ہی ہے۔ یہ قوم زمانہ قدیم میں عربستان میں دجلہ اور فرات کی گودیوں اور حلب کے مرغزوں میں ایرانی سرحد کے ساتھ ساتھ آباد تھی۔ اور ایران میں تبریز کے کوہ البرز کے دامن سے مشہد تک پھیلی ہوئی تھی۔ مال مویشی پالنا اور گردونواح کے زرخیز وشاداب علاقوں آبادیوں اور شہروں کو لوٹنا ان کا مرغوب پیشہ تھا۔

(تاریخ بلوچستان۔ میر گل خان نصیر)

قدیم وجدید تاریخی حقائق ومشاہدے بلوچوں کے حسب ونسب کے متعلق ہم اس فیصلے پر پہنچے ہیں کہ دراصل بلوچ عربی النسل ہیں لیکن ابھی مزید تحقیق کے سلسلے میں ہمیں بلوچوں کی قدیم روایات معتقدات اور تہذیبی وثقافتی پہلوؤں کو بھی دیکھنا ہوگا۔ تاکہ تحقیق کا بھی کوئی پہلو تاریکی میں نہ رہ جائے۔ خود بلوچوں میں بھی اپنی خاندانی عظمت کے سلسلے میں اور اپنی اصلیت سے متعلق قدیم سے سینہ بہ سینہ کئی روایات چلی آرہی ہیں۔ جن میں بظاہر تضاد ہے۔ مگر نظریاتی طور پر زیادہ اختلاف نہیں۔ ایک قدیم روایت کے متعلق بلوچ خود کو حضرت امیر حمزہؓ کی اولاد تصور کرتے ہیں اور وہ اس کے ثبوت میں بلوچوں کے قدیم دفتر کے ان اشعار سے استدلال کرتے ہیں۔ جو اس سلسلہ میں ان کے نام سند کے طور پر مستند چلے آرہے ہیں۔ چنانچہ ایک ایسا ہی مشہور ومستند شعر یہاں پیش کیا جاتا ہے۔

مامریدوں یاعلیؓ دیں ءَ ایمان شیتیں
حمزہؓ اولادیں، بلوچی سوب درگاہا بریں

اس تاریخی شعر کا مفہوم یہ ہے کہ بلوچ امیر حمزہ کی اولاد سے ہیں اور یہی وہ سعادت ہے جو قدرت کی طرف سے بلوچ کو ودیعت ہوئی ہے۔ بعض کے نزدیک اس کا صحیح مفہوم یہ ہے کہ ہم حضرت حمزہؓ کی دختر نیک اختر کے بطن سے ہیں کیونکہ حضرت امیر حمزہؓ کی نرینہ اولاد نہ تھی۔ اسی قسم کا ایک مشہور تاریخی شعر بلوچوں کی اصل جائے خروج کے متعلق بھی ہے۔ جس میں بلوچوں کا حلب سے آنا بتایا گیا ہے۔ وہ بلوچی شعر یہ ہے۔

اژحلبا پھاز کھایوں، گوں یزیدءَ جھیڑدیں
کربلا بھنپور نیاما، شہر سیستان منزلیں

اس شعر کا مطلب یہ ہے کہ بلوچ حلب سے نکل کر کربلا کے میدان میں یزید سے لڑے اور بعدازاں براہ بھنپور سیستان میں وارد ہوئے۔

قدیم بلوچی روایات اور تاریخی واقعات کے علاوہ بلوچی زبان اور تہذیب وثقافت کا جائزہ لینے سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ بلوچ عربی النسل ہیں۔ کیونکہ بلوچی زبان میں عربی کے الفاظ پائے جاتے ہیں۔ دراصل بلوچی زبان کی دو شاخیں ہیں۔ ایک سلیمانی جو شمال اور شمال مشرق یعنی سندھ اور علاقہ مری بگٹی سے ڈیرہ غازی خان کی طرف کے علاقوں میں بولی جاتی ہے۔ اور دوسری مکرانی جو جنوب مغرب میں ایران سے متعلق بلوچی علاقوں کی زبان ہے۔ یہ جدید فارسی سے بہت مشابہ ہے۔ مگر اصلی بلوچی زبان کے متعلق ماہر لسانیات کی یہ رائے ہے کہ بلوچی زبان فارسی سے مشتق نہیں۔ بلکہ وہ ایک مستقل زبان ہے جو زند یا پرانی باختری سے زیادہ ملتی جلتی ہے اور عربی زبان کے الفاظ اس قوم کی قدیم لسانی اور ثقافتی قدروں کی نشاندہی کرتے ہیں۔

تہذیبی اور ثقافتی لحاظ سے بھی بلوچوں کی طرزِ معاشرت اور خاندانی رسومات عربی تہذیب وثقافت سے قریب قریب ملتی جلتی ہے۔ مثلاً آج بھی دیہی بلوچ آبادی کے لباس کی وضع قطع قدیم عرب تہذیب وتمدن کی غماز ہے۔ صدیوں کی گردش کے بعد اس وقت بھی اکثر بلوچ قبائل کسی اور خاندان کے ساتھ رشتے ناطے نہیں کرتے۔ اسی طرح بلوچوں کی وفاداری، بہادری، مہمان نوازی اور اقرار کی پختگی کے علاوہ رزم وبزم کے واقعات کو نظم کرنا، یہ قدیم عرب تہذیب وثقافت کی آئینہ داری ہی تو ہے۔

o

جدید تحقیق

قدیم تاریخی روایات وواقعات کی تحقیق اور لسانی وثقافتی تجزیہ کے بعد بالآخر ہم اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ حسب نسب کے لحاظ سے بلوچ عربی النسل ہیں۔ اور ان کا اصلی وطن عرب ہے۔ اب بلوچ قوم کی تاریخ اور اس کے متعلق تحقیق کا مسئلہ ہے، جس کا حل ہمارے لئے آسان ہی سہی لیکن جدید تحقیق نے چونکہ قدیم نظریات وتحقیق کو غلط قرار دیا ہے، اس لئے اس موضوع پر ریسرچ کی ضرورت ہے۔ جدید تحقیق نے اپنے واقعات اور شواہد سے ثابت کیا ہے کہ بلوچ سامی النسل اور کالدی ہیں۔ مشہور بلوچ مورخ میر سردار خان گشکوری، ایم اے، اپنی تاریخی تالیف ''بلوچ نسل کی تاریخ'' میں ایک جگہ لکھتے ہیں کہ ''بلوس' مری' بلیدی تینوں کلدانی نسل کے قدیم ترین قبیلے تھے۔ لبنان کے پہاڑوں میں آج بھی ایک قبیلہ بلوس آباد ہے۔ قریباً دوہزار برس قبل نمرود بلوس' بابل میں برسر اقتدار تھا۔ اس نے نینوا۔ قلعہ اور رسین جیسے شہر آباد کئے۔ اسی وفد میں کلدانی نسل کا ایک اور خاندان موجودہ شام کے علاقے میں برسر اقتدار رہا''۔

ایک اور بلوچ مورخ ڈاکٹر میر عالم راقب اپنی تالیف '' تواریخ بلوچ'' میں بلوچوں کے حسب نسب سے متعلق ایک پرانا تاریخی حوالہ دیتے ہوئے لکھتے ہیں کہ '' اہل یونان اور رومانے ان کو کالدی کہا کبھی (RASSAU) کہا، لیکن آثار قدیمہ کی کھدائی سے نکلی ہوئی کندہ تختی نے یہ پیشگوئی بیان کر کے ثابت کر دیا کہ واقعی ''بلوس'' (Belus) ایک عظیم الشان انسان ہو چکا ہے۔ جس کی بیوی کا نام ''بلقیس'' تھا۔ اگر آج بلوچ کے متعلق آثار قدیمہ مکمل حالات پیش نہیں کر سکے تو ایسا مواد دستیاب ہوگا کیونکہ ہیروڈوس کی لکھی ہوئی تاریخ آثار قدیمہ سے حرف بحرف تائید ہوتی جاتی ہے۔ ہیروڈوس نے یہ تاریخ بابل کی شاہی لائبریری سے مرتب کی۔ جس میں بلوچ اور اس کے عظیم فرزند نینوس کا مقام اتنا بلند رکھا ہے کہ آج بھی اس مقام تک کوئی نہیں پہنچ سکا''۔

جدید تحقیق کے مذکورہ حقائق سے معلوم ہوا کہ حسب نسب کے لحاظ سے بلوچ سام النسل اور کالدی ہیں بلوچوں کی تاریخ مرتب کرنے سے متعلق بلوچ مورخین اور ادباء کا جو کنونشن کراچی میں ہوا تھا۔ اس کا متفقہ فیصلہ بھی یہی ہے کہ بلوچ کالدی اور سامی الاصل ہیں۔ لیکن اس کے باوجود حسب نسب سے متعلق تحقیقات کا سلسلہ ہنوز جاری ہے۔

تاریخ

بلوچوں کی تاریخ کے سلسلے میں اکثر مورخین متفق ہیں کہ وہ بلوچستان میں ایران سے آئے۔ اور تاریخی واقعات سے بھی یہ ثابت ہوتا ہے کہ بلوچ قوم بلوچستان میں مختلف راہوں سے وارد ہوئی۔ بلوچوں کا پہلا طائفہ جو برز کوہ یعنی کوہ البرز سے چھٹی صدی عیسوی میں ہجرت کر کے آیا تھا۔ بلوچستان کے دراوڑی زبان بولنے والے باشندوں میں برز کوہی قبیلے کے نام سے مشہور ہوگیا۔ جو دراوڑی زبان کے تلفظ سے بگڑ کر بروہی یا براہوئی پڑ گیا اور آج تک بلوچوں میں اسی طائفہ کے نام سے مشہور ہے۔

''بلوچوں کا دوسرا طائفہ جو دجلہ وفرات کی وادیوں اور حلب کے مرغزاروں میں آباد تھا، حوادث زمانہ سے نہ بچ سکا۔ بنوامیہ کے ظالم خلیفہ یزید بن معاویہ کے عہد میں جب معرکہ کربلا وجود میں آیا۔ بلوچ قبائل نے اس جہاد میں حضرت امام حسینؓ کی اعانت کی اور ان کی شہادت کے بعد یزیدی انتقام سے خوفزدہ ہو کر یا بطور احتجاج یہ قبائل میدانی علاقہ سے نکل کر حلب کے پہاڑوں میں پناہ گزیں ہوئے اور جب بنوامیہ کے سفاک عامل حجاج بن یوسف نے انہیں عراقی اور کوفیوں کے ساتھ تہ تیغ کرنا شروع کیا تو یہ مقابلہ کی تاب نہ لا کر وہاں سے ہجرت کر کے ایران آئے۔ چنانچہ سردار جلال خان کی قیادت میں بلوچوں کے چوالیس قبیلے حلب سے ہجرت کر کے ایران کے ایک شہر کے قرب وجوار میں آ کر آباد ہوئے۔ چونکہ مال ومتاع حجاج بن یوسف کی غارتگری کی نذر ہو چکا تھا۔ اس لئے گزارہ معاش نہ ہونے کی وجہ سے انہیں زندہ رہنے کیلئے لوٹ کھسوٹ کا پیشہ اختیار کرنا پڑا۔

جس کے باعث اس علاقہ کے حاکم بدرالدین نے بلوچوں پر لشکر کشی کی اور انہیں شکست دے کر ایران سے باہر نکال دیا۔ ایران سے یہ بلوچ قبائل مکران پہنچے اور "مند" اور اس کے نواح کے علاقوں میں بزور شمشیر قبضہ کر کے رہنے سہنے لگے۔ سردار جلال خان کے چار لڑکے۔ رند' لاشار۔ ہوت اور کڑا تھے۔ اور مائی جتو نامی ایک لڑکی تھی۔ سردار جلال خان کی وفات کے بعد قبائل نے میر رند کو اپنا سردار منتخب کیا' اور کئی پشتوں تک مکران میں رہے اور اس کے بعد انہوں نے مشرقی بلوچستان کی طرف پھیلنا شروع کیا"۔

(تاریخ بلوچستان' حصہ اول۔ گل خان نصیر)

درحقیقت سیستان سے ہجرت کا یہ سبب قطعی غلط ہے کہ بلوچوں کو لوٹ کھسوٹ کے بہانے مار نکالا گیا۔ بلکہ اس کی وجہ ایک واقعہ ہے جو رشتہ داری سے متعلق ہے۔ بدرالدین حاکم سے سرتابی کی وجہ یہی تھی بلوچوں نے چوالیس خوبصورت لڑکوں کو دلہنیں بنا کر بادشاہ کے محلسرا میں بھیج دیا تھا اور خود سیستان سے خروج کیا۔

بلوچوں کا تیسرا طائفہ "نارویٔ" بلوچ کے نام سے مشہور ہے۔ یہ بلوچ قبائل کی صورت میں بلوچوں کے میدانی علاقوں میں مکران کی سرحد کے بندر عباس تک، چاغی کی سرحد سے سیستان اور افغانی اور ایرانی سرحدوں کے ساتھ ساتھ قدیم سے آباد تھے۔ اس وقت یہ علاقے ایرانی حکومت کے زیر اثر تھے۔ جب نادرشاہ نے ایران کی حکومت پر قبضہ کرنے کے بعد اس سرزمین کی طرف رخ کیا تو بلوچوں کی کثرت آبادی سے متاثر ہو کر اس نے اس خطہ زمین کا نام "بلوچستان" رکھا اور بلوچوں نے بھی اسے اپنے حالات کے مطابق پا کر اپنا وطن قرار دیا اور اسے اپنی تہذیب وثقافت کا گہوارہ بنایا۔

ooo

"بلوچی ادب"

بلوچی زبان کا ادب اپنی گوناگوں خوبیوں کے لحاظ سے جہاں، بے حد دلکش اور رومانی ہے وہاں تہذیبی اور ثقافتی خصوصیات کی نمائندگی بھی کرتا ہے اور یہ اس لئے کہ اس کی تخلیق میں بلوچ ادباء اور شعراء کے ساتھ ساتھ بلوچی ثقافت کے سچے نمائندے اور عوامی ساج کے خالق کسان اور چرواہے پیش پیش رہے ہیں۔ اس لئے بلوچی ادب کا زیادہ حصہ لوک گیتوں پر مشتمل ہے، اور انہی لوگ گیتوں کی طرح رومانی کہانیاں بھی عوامی ادب کا حصہ ہیں۔

دنیا کی تمام مہذب زبانوں کی طرح، بلوچی زبان کا دامن بھی رومانی گیتوں رزمیہ شاعری اور تاریخی داستانوں سے مالا مال ہے۔ بلوچوں کی زندگی قبائلی رہی ہے اور ان کے درمیان قبائلی زور آزمائی ہوتی رہی لہٰذا ان کی باہمی خاندانی عداوتیں سالہاسال تک چلتی رہیں۔ چنانچہ بلوچی ادب کا زیادہ حصہ ان خصوصیات کی نمائندگی بھی کرتا ہے۔ اس لئے بلوچی ادب میں رزمیہ داستانوں کا بڑا ذخیرہ موجود ہے، جس میں قبائل کے باہمی مناقشوں اور ان کی آپس میں جنگ وجدل کا ذکر بھی ملتا ہے۔ اور یہ حصہ ادب زیادہ تر رزمیہ شاعری پر مشتمل ہے۔ اس کے علاوہ بلوچی زبان کا نثری ادب بھی ہے، یہ واقعاتی کہانیوں اور دینی ومذہبی مسائل سے متعلق طویل اخلاقی اور نصیحت آموز قصوں کا مجموعہ ہے۔ اس حصہ ادب میں پیغمبروں اور اولیائے کرام کے قصے بھی ہیں۔ اور بلوچوں کی اپنی بہادری اور غیرت کی داستانیں بھی، لیکن رومانی داستانیں تر گیتوں اور نظموں میں بیان کی گئی ہیں۔ ان رومانی داستانوں کی زبان بڑی سادہ اور صاف ہے۔ اور ان میں وہ خرابیاں نہیں جو بعد کے زمانے کے بعض جنگ ناموں میں پائی جاتی ہیں۔ ان میں وہ تصنع اور تکلف بھی نہیں جو بعض عشقیہ گیتوں میں ہے۔ ان رومانی داستانوں میں سے بعض کا

اسلوب بیان بعض پرانی رزمیہ داستانوں سے ملتا ہے اور ان کی زبان کافی پُرانی معلوم ہوتی ہے۔ یہ داستانیں زیادہ تر ''بلوچی رومان'' ہیں جیسے حانی وشہہ مُریدؔ دوستیں وشیرین، بیبر گ وگراں ناز، شہداد ومہناز، سمو توکلی، سسی پنوں، اور محبت خان سُومری، اور اگر ''لیلیٰ مجنوں'' کی طرح کوئی رومان باہر سے لیا گیا ہے تو اُسے بھی بلوچی ماحول میں پیش کیا گیا ہے۔

سلسلہ تحقیق کی رُو سے قدیم بلوچی ادب دراصل زیادہ تر کلاسیکی شاعری پر مشتمل ہے۔ اور اس کی مختلف اصناف ہیں۔ رزمیہ نظمیں، رومانی گیت، محبت آمیز نظمیں، مذہبی نظمیں اور مختصر اخلاقی نظمیں، ان میں لوریاں اور پہیلیاں بھی شامل ہیں۔ لوک گیتوں کا بھی اچھا خاصا ذخیرہ موجود ہے۔ بیرونی دنیا بلوچی ادب سے 1840ء میں متعارف ہوئی جبکہ مسٹر لیچ نامی ایک نامور انگریز سیاح نے بلوچی زبان وادب پر تحقیقات شروع کی۔ بہت محنت اور جدوجہد کے بعد اسے بلوچی زبان کی چند کلاسیکی نظمیں اور ان کے کہنے والوں کے متعلق معلومات حاصل ہوگئیں۔ اس محقق نے ان نظموں کے انگریزی ترجمے ''جرنل آف دی ایشیاٹک سوسائٹی بنگال'' میں شائع کرائے اور اس طرح بیرونی دنیا پہلی بار بلوچی زبان وادب سے متعارف ہوئی۔ بعد میں دوسرے انگریز محققین نے بلوچی ادب کی تحقیق کے لئے بلوچستان کے دور دراز علاقوں کے دورے کیے، انہیں اپنے مقصد میں کامیابی ہوئی اور مسٹر لیچ، لانگ ورتھ ڈیمز، گلبرٹ سن، سرالبرٹ برٹن، ای موکلر، لیوز پیرس اور رائے بہادر ہتورام کی تحقیقات، بلوچی ادب کا قابل قدر سرمایہ ہے۔

مسٹر لیچ کے بعد مسٹر لانگ ورتھ ڈیمز کا نام خصوصیت سے قابل ذکر ہے۔ ڈیمز نے بلوچی ادب کی تحقیق کے سلسلے میں بہت بڑا کام کیا ہے۔ انہوں نے لگاتار محنت وکاوش کے بعد بلوچی زبان وادب پر ایک تحقیقی کتاب ''بلوچی لینگویج'' کے نام سے 1891ء میں پنجاب گورنمنٹ پریس سے شائع کرائی۔ اس میں بلوچی زبان کی گرائمر، بلوچی افسانے اور لوک کہانیاں شامل ہیں۔ کتاب انگریزی، اردو، رومن میں

ہے، اس لئے اس پر بہت کاوش کی گئی ہے۔ مجموعی طور پر کتاب ہر لحاظ سے بلوچی زبان وادب پر تحقیقی دستاویز ہے۔ یہ کتاب سول سروس کے نصاب میں شامل تھی۔ مسٹر ڈیمز کی دوسری مشہور کتاب " پاپولر پوئیٹری آف بلوچیز" ہے۔ جسے ایشیاٹک سوسائٹی، لندن نے 1907ء میں بڑے اہتمام سے شائع کیا۔ اس ضخیم کتاب میں بلوچی زبان کی قدیم نظمیں اور اشعار ہیں۔ کتاب رومن رسم الخط میں ہے، آج بھی یہ کتاب بلوچی زبان کے شعری ادب پر مستند مانی جاتی ہے۔

مسٹر لانگ ورتھ ڈیمز سے پہلے مسٹر پیرس نے ڈسکرپشن آف دی مکرانی بلوچی ڈایلکٹ یعنی مکرانی بلوچی زبان کی کیفیت' کے نام سے 1875ء میں ایک کتاب شائع کرائی۔ ان کے بعد 1877ء میں میجر۔ای۔موکلر نے " گریمر آف دی بلوچی لینگویج" کے نام سے ایک تحقیقی کتاب پیش کی اور پھر ایک اور محقق پادری مسٹر اے لیوز نے " بلوچی سٹوریز" کے نام سے بلوچی زبان کی کہانیوں پر مشتمل ایک کتاب الٰہ آباد مشن پریس سے شائع کرائی۔ مجموعی طور پر مذکورہ کتب نے بلوچی زبان کو متعارف کرانے اور بلوچی ادب کو مجتمع کرنے میں بڑا کام کیا۔ ان کتب کے مصنفین لائق تحسین ہیں کہ انہوں نے اپنی سرکاری ونجی مصروفیتوں کے باوجود، بلوچی زبان پر تحقیق کی اور اس زبان کو دنیا میں متعارف کرانے میں بے لوث خدمت کی۔

مسٹر ڈیمز کے بعد جس انگریز محقق نے بلوچی زبان وادب کی تحقیق وترویج میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا، وہ مسٹر گلبرٹ سن ہیں۔ انہوں نے انگریزی بلوچی بول چال اور گریمر سے متعلق دو جلدوں پر مشتمل، ایک ڈکشنری تیار کی۔ اس میں انہوں نے بلوچی زبان کا دیگر ایشیائی زبانوں سے مقابلہ کر کے لسانی تعلق کا تجزیہ بھی پیش کیا ہے۔ یہ کتاب 1918ء میں شائع ہوئی۔ اس سے بلوچی زبان کو سمجھنے میں بڑی مدد ملتی ہے، اس لحاظ سے یہ قابل قدر کاوش ہے۔ اسی مصنف کی دوسری کتاب بلوچی کہانیوں کا ایک مجموعہ ہے۔ جسے بعد میں دیوان ہتورام نے انگریزی میں ترجمہ کرا کے 1922ء میں پنجاب گورنمنٹ پریس لاہور سے شائع کیا۔

یہ تذکرہ بلوچی زبان کو ضبط تحریر میں لانے کے ابتدائی دور سے متعلق ہے۔

مذکورہ کتب رومن میں لکھی گئی ہیں۔ کیونکہ اس وقت تک بلوچی زبان کا اپنا کوئی مخصوص رسم الخط نہیں تھا۔ اہل علم اس کمی کو عرصے سے محسوس کررہے تھے۔ بالآخر ان میں جناب حضرت مولانا محمد فاضل درخانی ؒ نے بلوچی اور براہوئی زبان کا رسم الخط وضع کیا۔ اس سلسلے میں موصوف نے عربی رسم الخط میں حروف تہجی کی مخصوص اشکال وضع کر کے بلوچی زبان کو باقاعدہ طور پر تحریر میں لانے کے لئے ایک اچھے رسم الخط کی بنیاد ڈالی جو بعد میں بہت مقبول ہوا اور اس میں تصنیف وتالیف کا کام عرصے تک جاری رہا۔

اس رسم الخط میں حضرت مولانا محمد فاضل درخانیؒ اور ان کے شاگردِ رشید مولوی حضور بخش کی تصانیف موجود ہیں۔ مولانا موصوف کے ایماء پر قرآن حکیم کا بلوچی زبان میں ترجمہ بھی کیا گیا۔ جو چھپ کر بہت مقبول ہوا، اس لحاظ سے بلوچی زبان کو ایک رسم الخط دینے کا سہرا جناب مولانا محمد فاضل درخانیؒ اور ان کے بعد جناب مولوی حضور بخش جتوئی کے سرہے، یہ رسم الخط مقبول ہوا۔ لیکن بعد میں حالات کے تقاضوں کے مطابق بلوچی زبان کے ادباء وشعراء نے اردو رسم الخط کو اپنا لیا۔ حالانکہ اردو زبان میں بعض بلوچی الفاظ کا صحیح تلفظ ادا نہیں ہوسکتا اس لئے آج بھی زبان کے ایک مخصوص ہیت تحریر یعنی رسم الخط کا مسئلہ بہت اہمیت رکھتا ہے۔ اور اس زبان کے اہلِ علم حضرات اس ضرورت کو شدت سے محسوس کرتے ہیں۔

بلوچی زبان پر زیادہ تخلیقی اور تحقیقی کام قیام پاکستان کے بعد شروع ہوا۔ اور آج بلوچی ادب میں وہ سب کچھ ہے، جو کسی مہذب زبان کے ادب میں ہونا چاہئے ادبیات کے علاوہ افسانہ، ڈرامہ، تنقید، تاریخ، رپورتاژ وغیرہ۔ آج کے بلوچی ادب میں موجود ہے اور اس لئے اس دور کی تخلیقات اور تصانیف کی فہرست طویل ہے۔ یہاں ان تخلیقات کا

ذکر کیا جاتا ہے۔ جو خصوصیت کی حامل ہیں۔ ان میں "بلوچی زبان وادب ء
بلوچی رومان' بلوچی ادب' قدیم بلوچی شاعری' مستاگ' ذرچین' بلوچی
لوزانک' شرگداری' بلوچی بومیا' درین اور سرمست بلوچستان' قابل ذکر ہیں"۔

"بلوچی رومان" بلوچی زبان کی رومانی کہانیوں پر مشتمل ہے، اس میں بلوچی
لوک کہانیوں کے تمام رومانی کردار پیش کئے گئے ہیں۔ یہ لوک کہانیاں اس سے پہلے یوں
صورت میں تحریر میں کہیں یکجا نہیں پیش کی گئیں۔ جناب انجم قزلباش، نے ان شہ پاروں کو
تحقیق کے بعد افسانوی انداز میں پیش کیا ہے۔ کتاب اردو میں ہے اس لئے اسے اردو دان طبقے
میں زیادہ مقبولیت حاصل ہوئی۔ قلات پبلشر نے اسے بڑے اہتمام سے شائع کیا ہے۔ پہلا
ایڈیشن ختم ہو چکا ہے۔ کتاب کا دوسرا ایڈیشن کسی دوسرے ادارے سے عنقریب چھپے گا۔

"بلوچی زبان وادب ء تاریخ" بلوچی زبان میں ہے اور یہ جناب شیر محمد مری
کی تحقیقی تصنیف ہے۔ کتاب میں بلوچی زبان وادب پر کافی مواد پیش کیا گیا ہے۔ آخر
میں قدیم شعراء کی چند غزلیں بھی نمونتہً پیش کی گئی ہیں۔ یہ کتاب کُل پاکستان لسانی
کانفرنس لاہور میں پڑھی گئی۔ جو ماہ اپریل 1961ء میں منعقد ہوئی تھی۔ کتاب بلوچی
اکیڈمی کراچی کی اولین پیشکش ہے۔

"بلوچی ادب"" جناب سلیم خان گمی" کی تصنیف ہے۔ اس کتاب کی
اشاعت کا مقصد بلوچی ادب کو ملک کے اردو دان طبقہ سے متعارف کرانا ہے اس لحاظ
سے یہ ان کی ایک مخلصانہ کاوش ہے۔ اس میں عوامی گیتوں کے اردو ترجمے بھی ہیں
اور بلوچی زبان کے شعری ادب کی تمام اصناف کو بھی پیش کیا گیا ہے۔ بہر کیف زبان
ومواد کے لحاظ سے ایک قابل قدر کاوش ہے۔

"قدیم بلوچی شاعری" میں بلوچی زبان کے شعری ادب کا گرانقدر سرمایہ ہے
یہ کتاب جناب میر خدا بخش مری، بارایٹ لاء کی تصنیف ہے۔ جسے "بزم ثقافت" کوئٹہ

نے اہتمام سے شائع کیا ہے۔ کتاب میں قدیم بلوچی منظومات کو اردو ترجمہ کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔ میر موصوف نے ہر شاعر کے سوانح حیات اور اس کے فن پر ناقدانہ نگاہ بھی ڈالی ہے۔ شروع میں مسٹر لانگ ورتھ ڈیمز کی مشہور کتاب ''پاپولر پوئیٹری آف بلوچیز'' کو رومن رسم الخط سے اضافہ کے ساتھ اردو رسم الخط میں منتقل کیا گیا ہے۔ اور یہ بہت بڑی کاوش کا کام ہے۔ جس کے لئے وہ لائق تحسین ہیں۔ کتاب میں بلوچی منظومات کو اُردو ترجمے کے ساتھ پیش کر کے اُردو دان طبقے کے لئے اسے سمجھنے کی آسانی فراہم کی گئی ہے اور اس کاوش سے کتاب کی افادیت میں اور اضافہ ہوا ہے۔ مجموعی طور پر یہ بلوچی ادب پر ایک گرانقدر پیشکش ہے۔

''ازمنہ بلوچ'' جناب میر خدابخش مری کو دوسری پیشکش ہے۔ اس میں تاریخ اور روایات ہیں اور کچھ حصہ بلوچی ادب پر بھی ہے۔ اصل کتاب انگلش میں ہے۔ جس کا اردو ترجمہ مسٹر ذکاء اللہ خان لودھی نے کیا ہے۔ جو بلوچی ادب سے گہری دلچسپی رکھتے ہیں۔ میر موصوف کی یہ کاوش بھی قابل قدر ہے۔ یہ کتاب بلوچی تاریخ اور ادب پر تحقیقی کتاب ہے۔

''مستاگ'' بلوچی اکیڈمی کراچی کی پیشکش ہے۔ ان میں بلوچی کے جدید ادباء وشعراء کا تعارف اور کلام پیش کیا گیا ہے۔ دوسرے معنوں میں اس لحاظ سے بھی اس کی افادیت اور اہمیت زیادہ ہے کہ اس میں بلوچی زبان کے دور حاضر کے لکھنے والوں کو ان کے فن پاروں کے ساتھ یکجا کیا گیا ہے۔ کتاب بڑی مختصر ہے۔ حالانکہ اسے ضخیم ہونا چاہئے تھا۔ اس کے باوجود بلوچی زبان کے دور حاضر کے ادباء پر تحقیق کرنے والوں کے لئے معلومات افزا کتاب ہے۔

''ڈرچین'' بلوچی کے مشہور ادیب ،جناب، بشیر احمد بلوچ کی تالیف ہے اس کتاب میں انہوں نے بلوچی زبان کے ملک الشعراء ، جام دُرک ڈومبکی کا گمشدہ کلام یکجا کر کے پیش کیا ہے اس لحاظ سے یہ گرانقدر کاوش ہے۔ مصنف موصوف نے کتاب کے

پیش لفظ میں بلوچی زبان کے اس عظیم شاعر کے سوانح حیات اور فن پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ اس سے کتاب کی افادیت میں مزید اضافہ ہوا ہے۔ یہ کتاب بلوچی اکیڈمی کوئٹہ سے خط نسخ میں شائع کی گئی ہے۔

''بلوچی شاعری'' بلوچی اور اُردو کے مشہور اہلِ قلم جناب ملک محمد رمضان بلوچ کی کاوش ہے۔ یہ ایک چھوٹا سا کتابچہ ہے۔ جسے محکمہ اطلاعات، کوئٹہ نے شائع کیا ہے۔ اس میں بلوچی شاعری اور اس کی خصوصیات کو پیش کیا گیا ہے۔ اس کی اشاعت کا مقصد اردو دان طبقہ کو بلوچی شاعری سے متعارف کرانا ہے۔ اس لحاظ سے یہ معلوماتی کتابچہ ہے۔ اس میں ملک موصوف نے بلوچی شاعری کی اقسام واصناف پر بحث کی ہے اور حوالہ جات کے لئے چیدہ چیدہ شعر دیئے ہیں۔ مواد و زبان کے اعتبار سے مفید کاوش ہے۔

''لوزانک'' ''شرگداری'' یہ دونوں کتابیں بلوچی زبان کے مشہور ادیب و شاعر جناب میر کریم بخش دشتی کی قابلِ قدر تالیفات ہیں۔ بلوچی ادب کے یہ دونوں مجموعے تحقیقی اور معلوماتی پر مشتمل ہیں۔ جو زیادہ تر عوامی ادب سے متعلق ہیں۔ بلوچی زبان میں نثری ادب پر یہ کتابیں گرانقدر حیثیت کی حامل ہیں۔ ان میں نثری ادب کے جن شہ پاروں کو پیش کیا گیا ہے۔ وہ عوامی ادب کا شاہکار ہیں اس اعتبار سے یہ دونوں مجموعے بلوچی ادب کی ترقی میں کارآمد مفید ثابت ہونگے۔ انہیں قابلِ مولف نے اپنے خرچ سے چھپوایا ہے۔ جو ان کی ادبی خدمات کی طرف قابلِ تحسین اقدام ہے۔

''بلوچی بومیا'' یہ کتاب جناب الحاج میر عبدالقیوم بلوچ کی بلند پایہ تصنیف ہے۔ بلوچی زبان کو سیکھنے میں یہ کتاب بڑی مددگار ثابت ہوئی ہے اور صحیح رہنمائی کرتی ہے۔ اس کتاب کی مدد سے بلوچی زبان کو سیکھنے اور سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔ کتاب کی اشاعت سے اردو دان طبقے کے لئے بلوچی سیکھنے کی ضرورت کی تکمیل ہوگئی۔ اور اس کے لئے مصنف موصوف تحسین کے قابل ہیں۔ ان کی یہ کاوش بلوچی زبان کی ترویج کے سلسلے

میں گرانقدر پیشکش ہے۔

''بلوچی زھگ بلد'' بلوچی زبان کا یہ قاعدہ بلوچی اکیڈمی کراچی کی پیشکش ہے۔ اس قاعدہ سے بلوچی زبان کے ابتدائی حروف والفاظ کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔قاعدہ میں کئی حروف تہجی کو متروک قرار دیا گیا ہے۔ اس لئے قاعدہ کی افادیت میں کمی آگئی ہے ۔حالانکہ یہ تمام متروکہ حروف تہی بلوچی زبان میں مستعمل ہیں۔ کسی زبان کی افادیت کا انحصار اس کے حروف تہجی پر ہے۔ جب حروف تہجی ہی مختصر ہوں گے تو وہ زبان کیونکر الفاظ کی گرانباری کی متحمل ہوسکے گی۔ بلوچی اکیڈمی کراچی کو اپنے اس اقدام پر نظر ثانی کرنا چاہئے اس طرح یہ قدم بلوچی زبان کی ترقی میں مُمد ثابت ہوگا۔

درین: یہ کتاب لوک گیتوں کا مجموعہ اسے بلوچی کے نامور شاعر جناب عطاشاد اور جناب ع، سلام نے مرتب کیا ہے، اس میں بلوچی لوک گیت اردو ترجمہ کے ساتھ پیش کئے گئے ہیں۔ لوک گیتوں کی اصناف سے واقفیت کے لئے ان کا تعارف بھی کرایا گیا ہے۔ جس سے کتاب کی اہمیت بڑھ گئی ہے۔ کتاب بلوچی اکیڈمی، کوئٹہ نے شائع کی ہے۔ ٹائیٹل بالکل سادہ ہے۔ لیکن کتاب نفیس ہے۔

''سرمستِ بلوچستان'' بلوچوں کے مشہور صوفی شاعر، توکلی مست کی شخصیت اور شاعری پر یہ کتاب معلومات افزاء مجموعہ ہے۔ کتاب ذکیہ سردار خان گشکوری بلوچ کی تالیف ہے۔ اس میں حضرت توکلی مست کے سوانح حیات پیش کئے گئے ہیں۔ اور ان کی منتخب نظمیں بھی دی گئی ہیں۔ ان نظموں کے ترجمے بھی ہیں۔ اردو دان طبقہ کو مست توکلی کی شخصیت اور شاعری سے متعارف کرانے کے لئے یہ کتاب کارآمد و مفید ہے۔ کتاب بلوچی اکیڈمی کی پیشکش ہے۔ ترجمہ میں محنت نہیں کی گئی اس کے باوجود مجموعی طور پر کتاب کارآمد ہے۔

بلوچی ادب کی تحقیق کے سلسلے میں یہ قدر ناشناسی ہوگی کہ اس زبان کی تحقیق میں بیرونی ممالک کے محققین کی مساعی جمیلہ کو نظر انداز کردیا جائے۔ لہٰذا یہاں ان کا

تذکرہ ضروری سمجھ کر سب سے پہلے جناب سید ہاشمی کی ادبی تخلیقات کا ذکر کیا جاتا ہے۔ سید موصوف کی ادبی خدمات زیادہ ہیں۔ انہوں نے بلوچی ادب پر جدید تحقیق کی ہے۔ ان کی شاعری کے مجموعے بھی شائع ہوئے ہیں۔ اب تک ان کی پانچ تصنیفات منظر عام پر آ گئی ہیں۔ جن کے نام یہ ہیں۔ ''سکمیں دستونک، بر تگیں بیر، انگر و تر ونگل، بلوچی ہنگیچ اور جز غم''۔ یہ کتابیں پڑھے لکھے بلوچوں میں بہت مقبول ہوئیں بلکہ بلوچی ادب سے دلچسپی رکھنے والے بیرونی حضرات نے ان کتب کی قدر کی ہے۔ ان کے بعد مشہور روسی ماہر لسانیات مسٹر زروبین اور این سکولوف کا نام آتا ہے۔ انہوں نے اپنے علاقہ مرد کی بلوچی زبان کی نظمیں جمع کیں اور ان کا ایک مجموعہ شائع کرا دیا۔ جو بلوچی ادب کے محققین کے لئے مفید اور دلچسپی کا سبب بنا اور اسے کسی حد تک مقبولیت بھی حاصل ہوئی۔ چنانچہ اسی کے پیش نظر اٹلی کے ایک ڈاکٹر جوزف اتفنبائن نے اس کتاب کا انگریزی ترجمہ 1963ء میں شائع کرایا۔ اس سلسلے میں مسٹر جان سٹرانتر کا ذکر بھی ضروری ہے، جو آسٹریا سے ایک محقق کی حیثیت میں یہاں آئے۔ تین سال بلوچی زبان و ادب پر تحقیق کر کے کافی ذخیرہ جمع کر لیا جسے وہ اپنے وطن میں شائع کرائیں گے۔ وہاں یورپ میں بلوچی زبان و ادب پر یہ تحقیقی کتاب ثابت ہوگی۔ کینیڈا کے جناب ڈاکٹر الحاج عبدالرحمن بارکر بھی بلوچی ادب پر تحقیقی کام کر رہے ہیں۔

بلوچی زبان کی ادبی خدمات کے سلسلے میں کوئٹہ کے بعض مقامی اداروں، بزم ثقافت اور بلوچی اکیڈمی نے بھی اچھا خاصا کام کیا ہے لیکن جس قدر کام ہونا چاہئے تھا وہ نہ ہو سکا، بلکہ وہ اس پیمانے پر بھی نہ ہو سکا جو ان اداروں کے لئے ضروری تھا۔ تاہم نہ ہونے سے اتنا بھی اچھا ہے اور اسے غنیمت سمجھنا چاہئے۔ ریڈیو پاکستان کوئٹہ بھی بلوچی زبان کی ترقی و تعمیر میں کوشاں ہے۔

بلوچی ادب کے اس مفصل جائزہ کی موجودگی میں یقین سے کہا جا سکتا ہے کہ

بلوچی ادب کی موجودہ رفتار حوصلہ افزا ہے۔توقع کی جاسکتی ہے کہ بلوچی ادب اپنی پوری قوت وتوانائی سے اپنے لئے ایک مقام پیدا کرلے گا اور آج بھی وہ دوسروں زبانوں کے ادب سے کسی طرح پیچھے نہیں ہے۔

بلوچی ادب کی تعریف میں یہ کہنا بھی بے جانہ ہوگا کہ یہاں ایسی نظموں اور گیتوں کی تعداد بہت ہے۔ جو بلوچوں کی زبان پر جاری ہیں۔سب سے پہلے ڈیمز نے ان نظموں کا باقاعدہ انتخاب کیا جو سلیمانی علاقہ (مری بگٹی) اور مغربی ڈیرہ غازی خان کے بلوچوں میں مقبول ہیں۔مکران کے علاقہ کی بلوچی شاعری کا اس طرح کا کوئی مجموعہ اب تک مرتب نہیں ہوسکا۔ البتہ مسٹر ڈیمز کے مجموعے میں مکرانی بلوچی ادب کی بعض نظمیں بھی شامل ہیں۔ ہر علاقہ کے اپنے شاعر ہیں۔ اگر جام درک، غلام محمد بالاچانی، سہنا بخش علی، بالاچ اور گل محمد زیب سلیمانی علاقہ کے بلوچوں کی نمائندگی کرتے ہیں۔تو مند ضلع کے ملا فاضل، عزت اور ملا قاسم' مکرانی علاقہ کے بلوچوں کے مشہور شاعر گنے جاتے ہیں۔ اس طرح اگر ضلع چاغی کے ناروئی بلوچوں کے عوامی شاعر قیصر خان' آزاد جمالدینی اور میر گل خان نصیر ہیں۔ توضلع قلات کے براہوئی بلوچوں کی نمائندگی فقیر تاجل' مولوی عبدالباقی دُرخانی' پیر محمد زہیرانی اور میر عبدالرحمٰن کُرد کرتے ہیں۔ الغرض مکران کے شاعروں نے بھی اسی لئے میں نغمے گائے۔جس میں سلیمانی علاقہ کے شعراء نے اپنے گیتوں کی تخلیق کی اس لئے ہم وثوق سے کہہ سکتے ہیں۔ کہ بلوچی ادب دوسری قوموں کے ادب سے کسی طرح بھی پیچھے نہیں بلکہ بلوچی ادب میں عوام کا حصہ زیادہ ہے۔ کیونکہ اسے عوام کے ان حساس لوگوں نے تخلیق کیا۔جو خود اس میں سے تھے اور عوامی خیالات وجذبات کی صحیح نمائندگی کے اہل تھے۔انہوں نے زبان کی فنی باریکیوں کی بجائے سادگی اسلوب بیان اور وحدت تاثر جیسی فنی خوبیوں کا خیال رکھا اور بلوچی ادب ان خصوصیات کی صحیح نمائندگی کرتا ہے۔

شہہ مُرید

بُلند پایہ شاعر، سوختہ جان عاشق

بلوچی ادب میں شہہ مُرید چاکر اعظم کے دور کا ایک بُلند پایہ شاعر اور سوختہ جان عاشق کی حیثیت سے مشہور ہے۔ حانی شہہ مُرید کا مشہور رومان اس سے وابستہ ہے ابتدائی حالات کے متعلق کچھ معلوم نہیں ہو سکا کیونکہ اس دور کے بعض اہم حالات تاریخ کا حصہ نہ بن سکے البتہ قدیم بلوچی تہذیب وثقافت میں اس دور کو نمایاں حیثیت حاصل ہے چونکہ وہ دور بلوچی نظم ونسق اور قیادت کا ابتدائی دور تھا، اس لئے چاکر اعظم ہی حقیقی معنوں میں اقتدار وقیادت کا محور تھا' ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ دور اس محور کے گرد گھومتا رہا اور ایسا کیوں نہ ہوتا جبکہ چاکر اعظم میں وہ صفات موجود تھیں، جو قبائلی نظام کے ایک قائد میں ہونی چاہئیں۔

شہہ مُرید کی شخصیت اور فن پر لکھنے کے لئے صرف اس کے رومان اور اس دور کے حالات سے مدد مل سکتی ہے۔ لیکن حالات زیادہ واضح نہیں اس کی چند مشہور نظمیں بھی ہیں جو قریب قریب اس رومان یا اس کے واقعات سے متعلق ہیں۔ اس لئے اس کی شخصیت اور فن کے بارے میں اس کے رومان ہی سے مدد مل سکتی ہے اور یہی اس کی داستانِ عشق بھی ہے اور داستان حیات بھی اور اس کی شاعری بھی اسی رومان میں نقطہ عروج پر ہے۔

کہتے ہیں شہہ مُرید ایک روز سیر وتفریح کے لئے کہیں جا رہا تھا کہ ایک بلوچ سردار ملک دینار کی چہیتی بیٹی حانی اپنی سہیلیوں کے ساتھ گھر سے کہیں باہر جا رہی تھی کہ نوجوان شہہ مُرید کی نگاہ اس پر پڑ گئی' اور وہیں جم کر رہ گئی۔ وہ حانی کے حسن وجمال کا گرویدہ ہو گیا۔ اور اس گرویدگی نے بالآخر محبت کی صورت اختیار کر لی۔

یہ بات شہ مُرید کے باپ میر مُبارک اور حانّی کے والد میر مندو کے کانوں تک بھی پہنچ گئی مگر ان دانشمند بزرگوں نے محبت کی راہ میں رُکاوٹیں اور قید و بند حائل کرنے کے بجائے غور و فکر کے بعد حانّی اور شہہ مُرید کی منگنی کر دی لیکن شاید قُدرت کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ تقدیر کے سامنے تدبیر کی کچھ نہ چل سکی، محبت کو آزمائش کی کسوٹی پر رکھا گیا اور اس طرح ایک معمولی سے واقعہ نے محبت کی پوری داستان تخلیق کر ڈالی۔

چونکہ اس دور میں بلوچوں کی تاریخ نہیں بنی تھی' بلکہ یُوں سمجھئے کہ وہ اپنے کارناموں سے اپنی تاریخ خود بنا رہے تھے۔ اس لئے اس دور کے تاریخی حقائق کی عدم موجودگی کی وجہ سے پرانی روایات اور قدیم بلوچی اشعار کا سہارا لے کر اس واقعہ کو یہاں اسی طرح پیش کیا جا رہا ہے، جو روایات و اشعار میں موجود ہے اور وہ کچھ اس طرح ہے کہ ایک دن سردار چاکر خان اور شہہ مُرید شکار سے واپس آ رہے تھے کہ راستے میں انہیں سخت پیاس لگی راہ میں شہہ مُرید کا گھر پڑتا تھا۔ یہ وہاں اُتر پڑے پانی طلب کرنے پر حانّی دو کٹوروں میں پانی بھر کر ایک قدح (پیالہ یا کٹورہ) اس نے سردار کو پیش کیا اور دوسرا قدح اپنے چہرہ کو دوپٹہ سے چھپاتے ہوئے آگے بڑھا دیا، جسے اس کے منگیتر شہہ مُرید نے اٹھالیا۔ کہتے ہیں کہ ان پیالوں کے پانی میں کچھ تنکے بھی تھے۔ سردار چاکر خان نے پہلے تو تھوڑا سوچا اور پھر ان تنکوں کو ہاتھ سے دُور کر کے پانی پینے لگا۔ وہ حانّی کی عقل و فراست اور حُسن سے بہت متاثر ہوا۔ نہ معلوم یہ کہاں تک صحیح ہے کہتے ہیں کہ کچھ عرصہ بعد اس نے حانّی کو حاصل کرنے کی کوشش کی اور بعد میں ایک خاص ذریعہ سے اسے حاصل بھی کر لیا۔ اور آزمائش کے طور پر اسے اپنے محل میں مقید کر لیا۔ شہہ مرید کی دنیا تاریک ہو گئی اور وہ رات رات بھر چاکر خان کے قلعہ نما محل کا طواف کرتا۔ نامہ و پیام کا سلسلہ بھی جاری رہا لیکن سب بے سُود بالآخر ایک دن بھری محفل میں دوران گفتگو شہہ مُرید سے نہ رہا گیا' اس نے چاکر خان پر طنز کیا۔ اس کے والد میر مبارک کو ناگوار گزرا

اس نے مرید کو محفل میں بے عزت کر کے نکلوا دیا۔ اس نے باپ کی زیادتی کو ایک نیک فرمانبردار بیٹے کی طرح برداشت کر لیا۔ لیکن اس نے ساتھ ہی یہ فیصلہ بھی کر لیا کہ اس بے عزتی کے بعد اب وہ ترکِ وطن کر کے کہیں چلا جائے گا۔ چنانچہ ایک دن وہ لوگوں اور عزیزوں واقرباء سے ملے بغیر گھر سے چل پڑا اور کعبتہ اللہ کی زیارت کا اشتیاق دل میں لے کر تنہا مکہ معظمہ کا رُخ کیا۔

شہہ مُرید نے محبت میں ناکامی کی وجہ سے وطن چھوڑ دیا اور فقیروں کی سی زندگی بسر کرنے لگا۔ لیکن اس کے باوجود اس کے دل کا گہرا زخم مندمل نہ ہو سکا۔ اس کی آنکھیں اکثر حاتی کی یاد میں پُرنم رہتیں اور اُدھر حاتی بھی شہہ مُرید کی یاد میں سوگوار رہتی، سہیلیاں اسے بہلانے کی کوشش کرتیں مگر اس کے دل سے مُرید کی یاد فراموش نہ ہو سکی ایک طویل عرصے کے بعد جب شہہ مُرید زیارت کعبتہ اللہ سے فارغ ہونے کے بعد وطن لوٹا تو یہاں اسے کوئی بھی پہچان نہ سکا۔ یہاں تک کہ جب وہ فقر کے لباس میں حاتی کے محل کے پاس صدا دیتا ہے تو وہ اسے اپنی دید سے محروم کر کے تال دیتی ہے۔ مُرید کو سخت صدمہ ہوتا ہے اور وہ پھر دیوانہ وار جنگل وبیاباں کی طرف نکل جاتا ہے۔ آخری بار جب شہہ مُرید واپس آتا ہے تو تیر اندازی کے ایک مقابلہ میں اول آنے کی وجہ سے پہچانا جاتا ہے۔ قبیلے میں خوشیاں منائی جاتی ہیں۔ میر چاکر بھی اس کی اس حالت سے متاثر ہو کر حاتی کو اپنی قید سے آزاد کر کے شہ مُرید کے حوالے کر دیتا ہے' کہتے ہیں کہ اس موقعہ پر شہہ مُرید حاتی کو اپنانے سے انکار کر دیتا ہے۔ اور یہ عذر پیش کرتا ہے کہ وہ اب اس کے قابل نہیں رہا۔ چنانچہ اس واقعہ سے متعلق شہہ مُرید کے یہ اشعار مشہور ہیں: ؎

حانو گلیں حانو گلیں! کھوفغ سراں شون مدے!
ازدیگاں کھور تحن
عشق ء تھی من سوتکھاں
جر دوازدہیں بندداغ داغھاں
درماں جتونیں رنگھاں
نی من تھی گیغائے آں
نی ذال ء تھوئے پکے منتاں!

O

"پھولوں کی طرح شگفتہ حانو!
مجھے اپنا سراپا نہ دکھا اپنے جمال کی رعنائیوں
سے میری آنکھوں کو خیرہ نہ کر تیرے عشق
نے مجھے جلا ڈالا ہے میرا جوڑ جوڑ اس آگ
سے داغ زدہ ہے۔
مجھ میں جوانی کی وہ طاقت نہیں رہی میں
اب کسی طرح بھی تمہارے قابل نہیں رہا!
بلکہ مجھے بھی اپنی طرح ایک عورت سمجھو!"
کیونکہ مجھ میں مردانہ صلاحیتیں نہیں رہی
میں تمہیں خوش نہیں رکھ سکونگا!!

کہا جاتا ہے کہ اس واضح حقیقت اور انکار کے باوجود حانی نے شہ مرید کا ساتھ نہیں چھوڑا اور اس کے پیچھے روانہ ہوگئی اور پھر اس کے بعد انہیں کسی نے نہیں دیکھا!

شبہ مُرید کی شخصیت کی طرح اس کے فن میں بھی روحانیت اور انفرادیت ہے، وہ محبت کا قائل ہے اور محبت ہی کی باتیں کرتا ہے۔ اس کی بیشتر نظمیں بلوچی شاعری میں اولیت حاصل کر چکی ہیں، یہاں اس کی ایک شاہکار نظم پیش کی جاتی ہے، جو بلوچی فن شاعری کا ایک بہترین نمونہ ہے۔ یہ شاہکار سوز و گداز سے لبریز اور دلی کیفیات کا آئینہ دار ہے، اس کا عنوان ہے "مہر پہ بہا گپتہ نہ بیت!" یعنی محبت خریدی نہیں جاتی! محبت...... شبہ مُرید...... حانی، ان میں کوئی تضاد نہیں، اس لئے اس شاہکار میں سوز و گداز عشق کی سرمستی، اور پُر خلوص اظہار پایا جاتا ہے اور انہی کی وجہ سے بھی نظم میں جوشِ خطابت اور موسیقی ہے۔ شبہ مُرید حانی سے اظہار محبت کرتے ہوئے عاجزانہ لہجے میں کہتا ہے:۔

حانی! منی رعدیں گروک
من نہ آنہی نوداں جنوک
لحمیں گمانی دور کنوک
حانی! ترا شاہ ءِ سرانت
اچ مَن سری ءِ جُھنڈ کن
مہر پہ بہاگپت نہ بیت!

O

حانی! دل ءِ تیراں ججن
شلیں نہان من ڈوبرا
اے رنگ منی ساہ نہ روت
موجیں دل ءِ نیست انت رضا!

زیر تو وتی جود ءِ جگ ءَ
برات ءَ دوگوشیں خنجر ءَ
شل دے منی پاکیں کش ءَ
ہردو کشاں پار گوزیت
حوں پہ حلکاں رچنت
پاک کن گون شارءِ پلوءَ
دست گون زباد و تنگواں
حنی رجیں موردانگاں
لیٹان ہما ہند ءَ کپن
جاتی تنی گل ءِ دپ ءَ!
صحی کہ بیا انت دسگہار
شارتی دوابانی شلی
لڈوک و ڈریں مہلی!
اَج تو ہمے پول ءَ کنت
شاہ ننگریں چیا جنگ؟
کسّی بدائی ءَ نہ ات!!
اچ وَت میار ءَ دور کنے
شہ پہ شپانی ءَ چرگ
ماگون میاراں پلنگ
میرچاکر ءِ بور ءَ جنگ!!

o

o

حانی! ترا منت کنن
منت و زاری ءِ کنن
گنڈی وہار ءِ من گورا
کشتے من ءَ لوگ ءِ دپ ءَ!
حانی گوں کونجیں گردن ءَ
گوں ہنگو مرواردان ءَ
درین ءِ من جیڑی ہمسراں
سیل و سواد و لنڈگاں!

o

حانی! ترا شاہ ءِ سرانت
اچ ماسری ءَ گھنڈ کمن
مارا پہ نیم بچی مچاژ
دل کوتگی چی ءِ نہ ایت
مہر پہ بہا گپت نہ بیت!!

o

میری پیاری حانی! بجلی کی طرح
چمک رہی ہو
بالکل اسی طرح جیسے کالے بادلوں
میں بجلی کوندتی ہے۔
میرے غموں کا مداوا تم ہو!
اے حانی تجھے شاہ کی قسم،
مجھ سے مُنہ نہ چھپاؤ۔
محبت خریدی نہیں جاسکتی
اے پیاری حانی!
میرے دل کو نگاہوں کے تیروں سے
چھلنی نہ کر'
ان تیز نوک والے برچھوں کو
میرے سینے میں نہ چلا'
اس طرح میں قتل نہیں ہوسکوں گا
شاید تمہارے دل میں میرے لئے
جگہ نہیں'
اگر صحیح ہے تو پھر اپنی تلوار اُٹھا
اپنے بھائی کے دودھارے خنجر
کو مجھ پر آزما'
اسے میرے بغل میں گھونپ دے
جب خنجر آر پار ہو جائے گا'

تو خون کا فوارہ بہہ نکلے گا۔
پھر تم اپنے دوپٹہ سے اسے صاف کرنا'
اپنے حنائی ہاتھوں سے پٹی باندھنا'
زیادہ خون بہنے سے میں بے ہوش
ہو کر گر پڑوں گا۔
تمہاری گلی کے سامنے جا کر گروں گا
صبح کو تمہاری سہیلیاں آ کر دیکھیں گی'
شارتی اور شان و شوکت والی شلّی'
اور ہرنی کی سی خوبصورت چال والی
مہلتی'
یہ سب تجھ سے پوچھیں گی
کہ شہ مرید کو کس نے مارا ہے۔
وہ تو کسی کا بھی بدخواہ نہ تھا۔
تم اپنے سے الزام دور کرنا'
اور کہنا کہ شہ مرید
اندھیری رات میں یونہی پھر رہا تھا
میں نے منع بھی کیا' لیکن وہ نہ مانا'
بالآخر میر چاکر کے ایک مست گھوڑے
نے اسے کچل ڈالا۔
حانی! میں تجھ سے منت کرتا ہوں
منت و سماجت کرتا ہوں'

خوبصورت ہار تمہاری گردن کی زینت

ہے

اور تمہاری گردن کو قدرت نے

خوبصورت بنایا ہے۔

اور ساتھ ہی اُسے سونا اور مروارید سے

سجایا ہے۔

اور جب تم اپنی سہیلیوں کے ساتھ

چلتی ہو۔

تو ایک عجیب کیفیت ہوتی ہے!

اے حاتی ! تجھے شاہ کی قسم

مُجھ سے مُنہ نہ چُھپا'

مجھے دُز دیدہ نگاہوں سے نہ دیکھ!

دل کو ہانکا نہیں جاسکتا'

اُور محبت خریدی نہیں جاتی!!

o

بیبرگ

(نڈر سپاہی، عظیم شاعر، صلح پسند انسان)

بلوچی زبان کا عظیم شاعر بیبرگ بلوچوں میں کسی تعارف کا محتاج نہیں۔ اس کی شاعری بلوچی ادب کا گراں قدر سرمایہ ہے۔ لیکن اس کی شخصیت، شاعری سے بھی زیادہ رنگین اور باوقار ہے۔ کیونکہ اس کی داستان حیات نے بھی اس کی شخصیت کو اُجاگر اور مقبول کرنے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔

بلوچوں کے عظیم سردار میر چاکر خان کے دور ہی میں بیبرگ کی شاعری بہادری اور شمشیر زنی کی داستانیں، بلوچی دنیا میں مشہور ہوگئیں۔

(بیورغ) بیبرگ قبیلہ رند کے ایک نامور سردار میر بہار خان کے ہاں پیدا ہوا۔ بچپن ہی میں شمشیر زنی اور تیراندازی میں مہارت حاصل کرلی۔ جوان ہوکر وہ بہادر اور بے باک بنا۔ میر چاکر خان اس کی بے باکی سے بخوبی واقف تھا۔ اس لئے اس نے کبھی کسی بات پر اسے نہیں ٹوکا۔ جب میر چاکر خان رندوں کے سردار اور کماندار کی حیثیت سے ''نلی'' کی مشہور تاریخی جنگ پر جانے کے لئے تیار ہوا۔ تو امن پسند بیبرگ نے اس کی گھوڑی کی لگام پکڑ کر عاجزانہ لہجے میں کہا ''رندوں کے عظیم سردار! جنگ قطعی ٹھیک نہیں، اور پھر گوہر کی اونٹنیوں اور انکے توڈول (بچوں) کے لئے بہادر رندوں کا خون بہانا کہاں کی دانائی ہے؟!''

یہ بات چاکر خان کے دل میں اُتر گئی، وہ سوچ میں پڑ گیا لیکن اس کے باوجود اس نے واپس جانے کی بجائے آگے بڑھنے کو ترجیح دی۔ کیونکہ قبائلی رواج وغیرت کے

مطابق اب اس کا واپس جانا معیوب تھا۔ اس موقع پر کچھ نوجوانوں نے بیورگ پر طنز کیا کہ وہ جنگ سے ڈرتا ہے بیورگ نے انہیں بتایا کہ وہ جنگ سے نہیں ڈرتا بلکہ قوم کو تباہی کے پیش نظر خانہ جنگی سے دور رکھنا چاہتا ہے۔ بات معقول تھا مگر کسی نے توجہ نہیں دی اور امن و آشتی کا یہ سچا علمبردار خاموش ہو کر رہ گیا۔

اس تاریخی واقعہ کا ذکر ذیل کی ڈرامائی نظم سے ملتا ہے۔ جس میں اس واقعہ کو پورے طور پر پیش کیا گیا ہے اس میں واقعہ کی خوب عکاسی کی گئی ہے یہاں پہلے بیورگ میر چاکر خان سے کہتا ہے:

چاکر سیرہاں کے کہاں
بل دے غصواں سیالیاں
گزآں مڑا چھوٹماں
گز آ' گرڈنیں بھوریناں

O

مرشی رنداں ءِ برے میڑیے
رند و میلائیں لاشاری
آف دیٔنوی مان آں
ہوشغ چھوف کھنت آپتی ءِ

O

گندوں کہ خدا چھو نہ کھنت
جنگاں کھئی دف ءِ حون کھنت
صوب سیت کھئی بہر بنت
مولاں ماں کھیا بڈ جنت

O

نوجوانوں نے بیرگ سے کہا:

پہنادی جتہ ورنایاں
ماتی سیر تمائیں بچھاں
بیرگ گونڈلاں سہمینتہ
شلّیں نیزغ و کھاٹاراں
ہندیاں مزاں کھودیناں
بڑچھی آں ہراس ءِ داشہ
ہمودا کہ روں دعوائی
چھوشیں لنگوے گوں گیڑوں
تھیر گشے تھرا دیر داری

O

بیرگ نے پھر چاکر سے کہا:

گشت بیرگ ءَ میرینا!
سردار رندان رابَر ئے مڑین نئے
رندان سرجمیع ءَ بیارے
میران ءَ مناں پھیدارے !
میرانیں ہماں درشک بَر
کہ قندھار ءَ شہ گرنت سوداگرا

O

ترجمہ:۔

میر چاکر اتنے جلد بازمت بنو!

بُغض اور غصّے کو تھوک دو

دُشوار گزار راستوں سے مت جاؤ

یہ خطرناک راستے گردن توڑ ڈالتے ہیں

O

آج آپ رندوں کو بالآخر لڑائیں گے!

لیکن جب رِندولاشار مقابل ہونگے

تو یہ آپس میں ایسے ٹکرائینگے'

جیسے سیلاب' پتھریلے بندوں سے ٹکراتا ہے۔

اور جیسے کہ درانتی گندم کے فصل کو کاٹتی ہے

یہ ایک دوسرے کو ایسے کاٹیں گے!

دیکھئے پھر خدا ان کا کیا حشر کرے گا۔

اس لڑائی میں وہ کسے شکست دیگا؟!

فتح وکامرانی نمعلوم کس کی قسمت میں ہے؟

اور بالآخر کون گھاٹے میں پڑیگا؟

O

نوجوانوں نے' جوخود کو بہادر سمجھتے تھے

طنزیہ طور پر کہا'

ہیرگ تیز نوکیلے تیروں

سے ڈرتا ہے'

اُسے تیز چمکیلے خنجروں' بڑے منہ

والی اور چوڑے پھل والی

ہندی تلواروں اور نوکیلی برچھیوں

سے ڈر لگتا ہے۔

خیر گھبرایئے نہیں' جب ہم محاذ پر

لڑنے جائیں گے تو ہم ڈھول

پیٹنے والے کو سمجھا دیں گے

کہ وہ تمہیں ان بلاؤں سے

دُور اور محفوظ رکھے!

o

بیبرگ پھر گویا ہوا کہ اے سردار

بالآخر آپ رندوں کو لڑا کر ہی

دم لیں گے!

اچھا تو پھر آپ ان جیالے رندوں

کو سلامت لانا'

اور مجھے میران زندہ بتانا!

یقیناً اسے دشمن زندہ نہیں چھوڑیگا

میران ایک ایسے تناور درخت
کا پھل ہے، جسے سوداگر دُور دراز
ملک قندھار سے لاتے ہیں!

O

سردار چاکر خان بالآخر بیرگ کی امن پسندانہ رائے کو ٹھکرا کر میدان جنگ کی طرف روانہ ہوا، بیرگ بھی مجبوراً اس کے ساتھ ہولیا کہ اس کے لئے اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا وہ اس جنگ کے انجام سے واقف تھا، لیکن وہ قوم کو چھوڑ کر کہاں جاتا؟ اس جنگ نے اتنا طول پکڑا کہ تیس سال تک جاری رہی اس میں رندولاشار کے بڑے بڑے سُورما کام آئے۔ بہادر میران بھی مارا گیا۔ صلح پسند بیرگ بھی بالآخر اس جنگ میں کام آیا، نتیجتاً سردار چاکر خان کو شکست ہوئی۔ وہ یہ ملک چھوڑ کر بچے کھچے رندوں کے ساتھ ست گرہ کی طرف چلا گیا۔ بعض روایات میں ہے کہ چاکر خان بیرگ کے ساتھ دل شکستہ حالت میں سبی سے گیا:

بیرگ کی صُلح جو طبیعت کا بھرپور مظاہرہ اس کے مشہور رومان
''بیرگ گراں ناز'' سے ہوتا ہے جس نے اس کی شخصیت کو اور اجاگر کر دیا۔ یہ واقعہ کچھ اس طرح ہے کہ بیرگ جو میر چاکر خان کا دست راست اور مشیر خاص تھا۔ کسی سیاسی مہم پر قندھار بھیجا گیا، وہاں وہ اپنا کام سرانجام دینے کے بعد ایک دن وزراء وامراء کے محلات سے گزر رہا تھا کہ ایک وسیع باغ کے کنارے محل کے دریچے میں ایک حسین وجمیل شہزادی کھڑی نظر آئی۔ بیرگ اس کے حُسن سے اتنا متاثر ہوا کہ اسے اپنا ہوش بھی نہ رہا، حسینہ نے جب یہ کیفیت دیکھی تو بیرگ کو قریب آنے کا اشارہ کیا، بیرگ جو اس وقت خوبصورت لباس میں ایک اچھی وضع کی گھوڑی پر سوار تھا۔ محل کے قریب پہنچا گھوڑی کو ایک طرف باندھا اور اس شہزادی گراں ناز کی خواہش پر وہ محل کی دیواروں پر کمند لگا کر

دریچے کے ذریعے محل میں پہنچا' بہت دیر تک ملاقات رہی اور اس طرح وہ اُسے گاہ بگاہ ملنے آتا۔ ایک دن شہزادی گراں ناز نے اسے بتایا کہ میرا بادشاہ مجھ سے بڑی محبت کرتا ہے وہ میرے لئے دیوانہ ہے اور مجھے تم سے بے حد محبت ہے۔ اگر ہمارا راز اس پر فاش ہوگیا تو پھر وہ ہم دونوں کو زندہ نہ چھوڑے گا، بہتر یہی ہے کہ تم مجھے اپنے وطن لے چلو'' بیرگ نے اُسے بہتیرا سمجھایا مگر وہ کسی بات پر آمادہ نہ ہوئی۔ بالآخر ایک دن وہ موقعہ پا کر گراں ناز کے ایما پر محل کے نیچے پہنچا، اُسے گھوڑی پر بٹھایا اور بولان کی طرف چل پڑا۔ کچھ روز بعد وہ قلعہ چاکر کی فصلوں کے پاس پہنچ گیا' اس موقعہ پر گراں ناز نے بیرگ سے کہا: اے میرے سردار تم نے مجھ سے کہا تھا کہ تمہارے پاس زبردست فوج ہے۔ اور دشمن بھی طاقتور ہے۔ بہتر یہ ہے کہ تم اپنے دشمن گہرام کے پاس چلے چلو اور اس کے پاس پناہ لو کیونکہ بادشاہ ہمارا تعاقب کرے گا اور میر چاکر خان گھر سے باہر محاذوں پر رہتا ہے پھر بادشاہ کا مقابلہ کیونکر کروگے؟''۔

گراں ناز کی بات صحیح نکلی' میر چاکر خان سبی کے قلعہ میں نہیں تھا' چنانچہ بیرگ گراں ناز کے مشورہ پر عمل کرتے ہوئے میر گہرام لاشاری کے پاس گنج آبہ' کی طرف روانہ ہوا' وہاں پہنچ کر اس نے میر گہرام کو بتایا کہ میں شاہِ قندھار' ذوالقون بیگ کی متاع بے بہا' گراں ناز کو ساتھ لایا ہوں' اور پناہ چاہتا ہوں۔ میر گہرام نے بلوچی غیرت وحمیت کے پیش نظر اپنے مخالف بیرگ کو اپنے ہاں پناہ دی' تیسرے روز جب شاہ قندھار کی فوج درّہ بولان کے پاس پہنچ گئی' تو میر گہرام نے اپنے ایک خاص ایلچی کے ذریعے میر چاکر خان کو پیغام بھجوایا کہ بیرگ ایک زبردست مصیبت کو لایا ہے۔ اس کے ساتھ بادشاہ کی ''متاع بے بہا'' ہے اور وہ تعاقب میں یہاں پہنچ گیا ہے۔ اس موقع پر ہمیں اپنے تمام اختلافات ختم کر کے متحد ہوجانا چاہئے۔ چنانچہ اس پیغام کے ملتے ہی میر چاکر خان فوراً تیار ہوکر اپنی عظیم سپاہ سمیت میر گہرام کے پاس پہنچ گیا اور دو عظیم لشکر لڑائی کے لئے تیار ہوگئے۔

صلح جُو بیرگ نے جب دیکھا کہ معاملہ لڑائی تک پہنچا ہے تو وہ بہت دیر تک سوچتا رہا' کیونکہ وہ جنگ نہیں چاہتا تھا' بالآخر اس کی مفکرانہ وضع اور معاملہ فہمی کام آئی، اس نے سردار میر چاکر اور گہرام سے کہا کہ میں پہلے دشمن کے کیمپ کا پتہ لاتا ہوں' پھر ہم آگے بڑھیں گے۔ لہٰذا وہ ایک محافظ دستہ ساتھ لے کر چل پڑا۔ اسے ایک جگہ متعین کیا اور رات کو موقع پا کر اس نے تنہا دشمن کے کیمپ کے گرد چکر لگایا اور ایک موزوں جگہ پر گھوڑے کو باندھ کر چھپتا چھپاتا بادشاہ کے خیمے کے پاس تنہا پہنچا' محافظ نے دیکھ لیا۔ لیکن قبل اس کے کہ وہ کوئی اقدام کرتا بیرگ نے ایک ہی وار سے اس کا کام تمام کر دیا اور شاہی خیمے کی مضبوط رسیاں کاٹ کر سر ہتھیلی پر رکھے خیمے میں داخل ہوا' بادشاہ ترکی شال اوڑھے سویا ہوا تھا' بیرگ اپنی تجویز کو عملی جامہ پہنانے کیلئے بادشاہ کے قریب گیا اور اس نے شاہ کو ہاتھ سے پکڑ کر اٹھاتے ہوئے جرات مندانہ لہجہ میں کہا:

میں بیرگ ہُوں!

جسے آپ بخوبی جانتے ہیں۔

میں آپ کا قصُوروار ہوں

اور بخشش بادشاہوں کا کام ہے!

میں صرف اپنے لئے' بے گناہ

انسانوں کا خون بہانا نہیں چاہتا'

اس لئے خود آیا ہُوں'

اگر آپ مجھ پر رحم نہیں کر سکتے تو پھر

آپ کے رحم وکرم پر ہوں
یہ آپ کی تلوار ہے اور یہ میری گردن!!

(ترجمہ)

O

تدبر، جواں مردی، بہادری اور امن پسندانہ کردار کی اس سے بہتر مثال شاید ہی کہیں مل سکے...... بیبرگ نے یہ دانشمندانہ اقدام صرف اس لئے کیا کہ وہ اپنے لئے بے گناہ انسانوں کا خون بہانا نہیں چاہتا، بے پناہ لشکر سپاہ کے باوجود وہ لڑنا نہیں چاہتا اور یہ اس لئے کہ وہ امن چاہتا ہے جنگ نہیں چاہتا۔ اس نے جنگ کو ٹالنے کے لئے بادشاہ کے خیمے میں داخل ہو کر خود کو پیش کر دیا تھا کہ اس کی وجہ سے جنگ نہ لڑی جائے۔ چنانچہ یہی ہوا، شاہ ذوالنون نے اپنے چند مصاحبوں کو بلایا اور کچھ مشورہ کے بعد اس نے بیبرگ کو معاف کر دیا اور بہادری کے اعتراف کے طور پر اسے ایک بیش قیمت سرخ شاہی لباس بھی عطا کیا۔ جنگ سروں سے ٹل گئی شاہ ذوالنون اپنی فوج کے ساتھ درہ بولان کے راستے واپس اپنے وطن چلا گیا۔ بیبرگ نے علی الصبح اپنے لشکر میں پہنچ کر میر چاکر اور میر گہرام کو خوشخبری سنائی کہ وہ فتح یاب ہو کر لوٹا ہے۔ جنگ کا خطرہ ٹل گیا ہے اب جنگ نہیں لڑی جائے گی! اگلے روز بیبرگ فتح یابی کی حالت میں سبی پہنچا، اور قلعہ چاکر خان میں چاکر اعظم کے قریب ایک محل تعمیر کر کے ہمیشہ کے لئے وہاں قیام پذیر ہوا، اس واقعہ کے متعلق اس نے اپنی شاعری میں ایک جگہ کہا ہے:

کوئی میرے لئے قیدی نہیں بنا!
اور نہ میرے لئے رندوں اور لاشاریوں
کو جنگ کی آگ میں کودنا پڑا

میں سردار چاکر خان کے زیرِ سایہ
شگفتہ دلی و آسودگی سے اپنی محبوبہ
گراناز کے ساتھ رہتا ہوں!
اور اکثر اس کے سنہری بار
سے کھیلتا ہوں، ہماری زندگی شادمانیوں کا
گہوارہ ہے۔

(بلوچی سے ترجمہ)

بلوچوں کی قدیم تاریخ میں بیبرگ[1] سے زیادہ صاحب تدبیر، صلح جُو اور عظیم شاعر ڈھونڈے نہیں ملتا، یہ سب خوبیاں ایک انسان میں مشکل سے ملتی ہیں۔ اس کی زندگی واقعی شادمانیوں کا گہوارہ ہوتی لیکن افسوس کہ ایسا نہ ہُوا، مشہور تاریخی تیس سالہ جنگ میں، جس کو روکنے کے لئے اس نے بڑی کوشش کی تھی، ایک دستے کی کمان کرتا ہوا مارا گیا، اور اس طرح امن و آشتی کا یہ علمبردار جنگ کے شعلوں کی لپیٹ میں آ گیا[2]...... جنگ سے اُسے نفرت تھی۔ لیکن اس کے انکار کے باوجود اسے جنگ کی آگ میں دھکیل دیا گیا اور اب اس کے بعد بلوچوں میں پھر ایسا بہادر، مُفکر، اور صلح جُو انسان پیدا نہ ہوا۔

---

1. بیبرگ کو مشرقی حصے کے بلوچ بیورغ کہتے ہیں، یہ اس زبان کا لہجہ ہے۔
2. بعض روایات میں یہاں اس کا زخمی ہونا بتایا گیا ہے اور اس کی موت ست گرو میں واقع ہوئی۔

میران رند

میران رند بلوچوں میں ایک بڑا بہادر اور جنگجو شخص گزرا ہے۔ یہ ہمیشہ بہادر رندوں کا کماندار رہا ہے۔ مشہور بلوچ ہیرو میر چاکر خان رند کا دست راست' اس کے بچوں کا ماموں' اور میر شہداد رند کا بیٹا تھا' جب سردار چاکر خان نے سبی میں اپنی جگہ بنائی اور قلعہ میں رہنے لگا' تو میران رند بھی ''ڈھاڈر'' کے مقام پر ایک مضبوط قلعہ بنا کر نائب الحکومت کی حیثیت سے رہنے سہنے لگا۔ میران رند میر چاکر خان کے محکمہ جنگ کا سربراہ بھی تھا۔ رندوں کی تاریخ میں اس کو بڑا مقام حاصل ہے بلکہ یہ حقیقت ہے کہ رند سرداروں کی تاریخ میران کے بغیر نامکمل ہے۔

میران' رند و لاشار کی مشہور تیس سالہ جنگ میں نلی (علاقہ سوران) کے مقام پر لڑائی میں مارا گیا۔ یہ جنگ گاجان کے قریب لڑی گئی تھی۔ سردار میر چاکر خان کو میران کی بے وقت موت سے بہت صدمہ ہوا' وہ اکثر مغموم رہنے لگا' بلکہ وہ اپنی فتح سے بھی مایوس ہوگیا۔ چنانچہ ایک روایت کے مطابق اس نے ترکوں سے مدد حاصل کی اور لاشاریوں سے نبرد آزما ہوا۔ اس میں اس کو فتح حاصل ہوئی اس نے لاشاریوں کو شکست فاش دی۔ بعضوں کو قتل کیا اور بعض کو ملک سے نکال باہر کیا۔ اس کے باوجود وہ میران' کے مرثیہ میں ایک جگہ کہتا ہے۔

میران تھئی طمیں غماں
یک کترہ ئے سوداتگاں

☆☆☆

میراںؔ تیرے تیز غموں سے
صرف ایک قطرہ کم ہوگیا ہے!!

گاجانؔ کی جنگ کا حال ذیل کے شعر سے ظاہر ہوتا ہے، کہ میر چاکر خان کے رندوں نے لاشارؔ کو اس طویل جنگ میں کس قدر برباد و پامال کیا۔

گاجان ءَ کھتہ ہڈ ءِ ڈھیر
سالے تولگاں واڑ تھہ سیر!

O

گاجانؔ ہڈیوں کا ایک ڈھیر
بن گیا اور گیدڑوں نے برسوں
کی خوراک اکٹھی کرلی۔

بلوچی لوک گیتوں اور کہانیوں میں اکثر گوہرؔ، شلیؔ اور شاریؔ تین بہنوں کا ذکر آتا ہے جو ''جت'' قبیلہ سے تعلق رکھتی تھیں۔ گوہرؔ میر چاکر خان رند کی قیام گاہ بی میں اس کے پڑوس میں رہتی تھی۔ بعد میں اسے تاریخی حیثیت حاصل ہوگئی۔ رندو لاشار کی مشہور تیس سالہ جنگ کی ابتداء بھی اس عورت سے ہوئی اس واقعہ کے متعلق مختلف روایات ہیں..... گوہرؔ کی بہن شاریؔ ڈھاڈر میں مشہور بلوچ کمانڈر میراںؔ رند کی ہمسایہ رہی۔ حسن و جمال کے لحاظ سے دونوں بہنیں یکتائے روزگار تھیں۔ میراںؔ شاری کے بے پایاں حُسن سے سخت متاثر ہوا۔ بعد میں اس کیفیت نے عشق کی

صورت اختیار کرلی۔ اور ان کی محبت کے چرچے ہونے لگے۔ میران نے شاری کے عشق میں کچھ اشعار کہے ہیں ذیل کی طویل نظم اس نے اپنے رومان اور مہمات کے متعلق کہی ہے۔ مجموعہ کلام ناپید ہے۔ یہ نظم اس کا شاہکار ہے:

نمونہ کلام:

"کپوت"

کہنی کپوت برجا ہے!
مے گوں بمبوا[1] ءَ دوست واۓ
ہر دو عاشقانی ساہۓ
چیدا بال کن و اودا برو
گنور گوں میڑو[2] ءَ چتے گا
شاری[3] وشلی[4] اش مان انت
بام ءَ گرک[5] ءَ شیف بۓ
پیہیۓ پہ گل ءَ آستین ءَ
چانپان زور مدے زبریناں

o

۱۔ شریں۔ ۲۔ دیوان۔ ۳۔ میران و معشوق و ہام۔ ۴۔ حسن و گلیچ و ہام۔ ۵۔ زرد و بالا۔

O

(نوا) جان ءَ دور کنئے دوست بیگا
دوست ءِ دشمناں دیرءَ کت
پُرسی تئی دل ءِ احوالاں
چے ءَ کانہل ٦ ءِ بنزیں مرگ
چہ تھام دہ ءِ مرگانئے
(بانک) چہ لاہور دہ ءِ مرگاناں
دوشی ئیمیں شپ ءَ زی ئیمیں روچ
یکوئی شلان ءَ کاتکاں
پیغام گوں منا رندانی
ہمبوئیں سلام میرانی

O

٦۔ مانڈگ ژند۔ ے۔ وشیں۔

o

ڈرک ۸ ءَ محل ۹ کنئے سبزیں مُرگ
طفلی واب براں زانڈیا ۱۰
صحمی ماں رشی آ لوگ ءَ
کشی ماں گرژ ءُ گندیمان
مصری شکلان سارتیہنان
زگی روغنان زردینان
ایشان بر پرائے میران ءَ
میران انت ہما درشک ءِ بر
چہ قندھار گرنت سوداگر
اللہ بیار ملک میران ءَ
رند تنگویں ۱۱ ہیران ءَ
پڑانی سر ءَ گمپ ۱۲ جنت
بال وات و کپوت ءَ بلیت
بُر تو چہ امان اللہ ءِ

o

۸۔ کوکیں۔ ۹۔ حرم کے بوشتے۔ ۱۰۔ بی بی۔ ۱۱۔ درویشیں۔ ۱۲۔ وش بُو !!

"کبوتر"

اے کبوتر!
تم مجھے اور میرے دوست کو یکساں عزیز ہو
(کیونکہ) تم ہم دونوں (عاشق و معشوق) کے محرم راز ہو
میں التجا کرتا ہوں کہ یہاں سے پرواز کر اور وہاں جا
جنّوں کی قیام گاہ تک،
جہاں شارَنی اور شلَنی اقامت رکھتی ہیں،
چھت کی راہ گھر میں اُتر کر
دوست کی آستین میں پناہ لینا
لیکن خیال رکھنا کہ تیرے تیز پنجے
کہیں دوست کو کوئی خراش نہ پہنچائیں
وہ تمہیں دوست اور دشمن دونوں سے بچا کر
تخلیہ میں تمہارا حال پوچھے گا اور کہے گا کہ
تم کیوں اس قدر ہلکان ہو رہے ہو

اور کس ولایت سے آ رہے ہو۔

اس پر بہ ادب کہنا کہ میں لاہور کے کبوتروں کے خاندان سے ہوں
وتھکان کی وجہ یہ ہے کہ کل رات اور کل دن سے
مسلسل پرواز کر کے یہاں پہنچا ہوں۔

میں رندوں کا پیغامبر ہوں
اور میران کا سندیسہ لایا ہوں۔

یہ سن کر دوست التجا کرے گا کہ کچھ دیر اور ٹھہر!
اس وقت تک جب تک کہ پاس پڑوس کے لوگ نیند کی آغوش میں چلے جائیں۔

اور تا کہ میں اپنے گھر سے گڑ اور گندم'
اور مصری اور زرد گھی (آپ کے حوالے کر سکوں)
تا کہ آپ انہیں میران کے لئے لے جا سکیں
میران ایسے درخت کا پھل ہے۔
جو قندھار سے ہی دستیاب ہو سکتا ہے
اے اللہ تو میران سے ملا دے!
رندوں کے سونے جیسے جوان رعنا سے'
ان دعاؤں کے ساتھ اس نے کبوتر کو
اجازت دی اور کہا جا' اللہ تمہاری حفاظت کرے!

O

ملک الشعراء

جام دُرّک

بلوچوں کے ممتاز قبیلہ ڈومکی میں دو عظیم شاعر دودا ڈومکی اور جام دُرّک گزرے ہیں۔ دودا علم الانساب کا ماہر اور ہجوگو شاعر تھا۔ اس سے بڑے بڑے بلوچ قبائل کانپتے تھے کیونکہ اس کی زبان میں تلوار کی سی کاٹ تھی۔ اس لئے کئی ممتاز خاندانوں کو اس کی ہجوگوئی نے منزلِ اقبال سے قصرِ مذلت میں گرادیا۔ اس کی شاعری میں اپنے دور کے مظالم کی جھلک بھی پائی جاتی ہے۔ مگر زیادہ حصہ ہجوگوئی کا ہے اس لئے وہ اپنے عوام میں مقبول نہ ہوسکا۔

جام دُرّک رومانی شاعر تھے۔ بلوچی ادب میں انہیں رومانی اور فطری شاعری کا موجد مانا جاتا ہے چونکہ بلوچی شاعری کا زیادہ حصہ رزمیہ نظموں اور لوک گیتوں پر مشتمل ہے۔ اس لئے جام دُرّک کی رومانی شاعری ایک علیحدہ مقام رکھتی ہے۔ وہ ایک طائرِ خوش نوا کی طرح تھے، ان کا کلام محبت کے سوز و گداز سے لبریز ہے۔ وہ اپنے کلام میں محبت اور زندگی کے لئے جدوجہد کا درس دیتے ہیں۔ ان کے تخیل کی پرواز کوہ سلیمان کی بلند برفانی چوٹیاں بھی نہ روک سکیں اور ان کی عقابی نظروں کے سامنے منگچر کے وسیع و عریض میدان کا لامحدود دائرہ بھی مختصر ہو کر رہ گیا ہے۔

بلوچی شعرائے کرام کے دورِ متاخرین میں چار بڑے شاعر، جن قاضی نور محمد گنج آبوی' اور ملک الشعراء جام دُرّک' میر نصیر خان' خان اعظم قلات کے زمانے میں تھے اور ملا فاضل، ملا تاحق مکرانی اور مرزا احمد علی ان کے بعد ہوئے۔ مگر جام دُرّک ہی صرف بلوچی

زبان کے شاعر تھے۔ قاضی نور محمد اور مرزا احمد علی فارسی زبان میں کہتے تھے اور ناطق اردو کے بہترین و مشہور شاعر مرزا غالب کے ہمعصر تھے۔ بلوچی زبان کے شعراء کرام میں جام دُرّک کا مرتبہ عرب کے زمانہ جاہلیت کے مشہور شاعر اُمراء القیس کے برابر ہے۔ اس لئے میر نصیر خان اعظم نے اپنے اس جادو بیان شاعر کو ملک الشعراء کا خطاب دیا۔

اس عظیم شاعر کا نام دُرک تھا یعنی دُرنایاب کی مانند اور جام تخلص کرتے تھے ،حالانکہ قدیم سندھ کے سلاطین اور لس بیلہ کے حاکموں کا یہی لقب تھا۔ اس نسبت کے متعلق کچھ معلوم نہیں ہوسکا۔ ان کا کلام پہلے ناپید تھا۔ مگر اب ''درچین'' کے نام سے مجموعہ کلام منظر عام پر آچکا ہے جسے بلوچی زبان کے ایک نامور ادیب ،واجہ بشیر احمد بلوچ نے مرتب کیا ہے اور یہ ان کی قابل قدر کاوش ہے۔

جام دُرّک کو دوسری دنیا سے متعارف کرانے کے لئے یہاں ان کی شخصیت اور شاعری کے کچھ نمونے پیش کئے جارہے ہیں دراصل یہی چھ سات طویل نظمیں اس کا شاہکار ہیں۔ یہاں انہیں منظوم طور پر اردو زبان میں منتقل کیا جارہا ہے۔ بلوچی زبان میں ان نظموں کا مقام بہت بلند ہے اور اس لحاظ سے وہ بلوچی ادب کا شیکسپیئر مانا جاتا ہے۔

اس عظیم شاعری کی ایک نظم جس کا عنوان ''ڈھاڈر کا بازار'' ہے۔ منظر کشی اور محبت کے تاثرات کا حسین مُرقع ہے۔ شاعر کا گزر ڈھاڈر کے بازار سے ہوتا ہے۔ اچانک اس کی نگاہ ایک حسینہ پر پڑتی ہے اور وہ اس کے بے مثال حسن سے متاثر ہوتا ہے وہ خود بھی مسافر ہے۔ اور اس کی دلپسند حسینہ بھی' اُسے اس بات سے دُکھ ہوا وہ اس المیہ کو..... پُر درد لہجہ میں یُوں بیان کرتا ہے۔

میں اک روز ڈھاڈر کے بازار میں جب گیا
مُعطر تھا بازار، مُشکِ خُراسان سے!!
جو دیکھا تو حیرت ہوئی یہ کہ مشک عجیب

کسی رشکِ شیریں حسینہ کی زلفوں کی بُو باس ہے!
کہ جس سے ہے ساری فضا کیف زا'
یہ کیوں کر کہوں کہ وہ مہ لقا'
حسیں کس قدر تھی!
کہ ہونٹوں پہ سُرخی تھی مسواک کی
تو دانتوں کی تھی دلرُبا وہ چمک
یمن کے حسین موتیوں کی چمک سے بھی افزوں
تھا موزوں سے قد پر اک موزوں لباس
ادا اُس کی ایک ایک تھی آپ اپنی مثال
کہا میں نے دل میں کہ اے مہ لقامہ جبیں!
یہ اک لمحے کا حادثہ' کیا محبت نہیں؟!

O

الوداع اے جمالِ جہاں سوز اَب الوداع!
جو چاہا تو ہوگا محبت کا یہ فیصلہ'
ملیں گے پھر اگلے برس موسم گُل میں ہم'
مُلاقات ہوگی یہیں' اس کشادہ سے بازار میں!!

O

دوسری نظم جس کا عنوان "پیام" ہے۔ اس میں شاعر اپنی محبوبہ کا پیام ملنے پر گزرے ہوئے زمانے کو یاد کرتا ہے اور محبت کے ان برگزیدہ لمحات کی یاد میں اس کی آنکھوں میں آنسو آجاتے ہیں۔ یہ پیام کوئی پیامبر نہیں لایا بلکہ قوس قزح نے ظاہر ہوکر شاعر کو پیام دیا کہ انہی دنوں ملاقاتیں ہوتی تھیں اور ایسا ہی حسین سماں ہوتا تھا۔ جبکہ گھنے چنار کے نیچے پہروں باتیں ہوتی تھیں۔ یہاں شاعر اپنے افسانہ غم کو اس طرح رقم کرتا ہے:

آج شب کو جنوب کی جانب
جب اچانک مری نگاہ اٹھی
قرمزی رنگ کی گھٹاؤں سے
برقِ سوزاں کچھ اس طرح چمکی
جیسے میخانے سے کوئی میخوار
لڑکھڑاتا ہُوا نکلتا ہے!
آؤ اب تھام لو ذرا مُجھ کو
میرا دل زور سے دھڑکتا ہے!
آج کچھ ترک جنگجو کی طرح
اس نے جنگ و جدل کی ٹھانی ہے
کیوں نہ آخر لڑے یہ زور آور
جبکہ قوس قزح نے جاناں کا
اِک مُسرّت بھرا پیام دیا
ایک بُھولا ہوا فسانہ غم
آج مدّت کے بعد یاد آیا
آہ ! وُہ سربلند حسین چنار
جن کے سائے تلے کبھی مِل کر
مجھ کو اُلفت بھری حسین باتیں
مُسکرا کر بتائی تھیں اُس نے

گویا اُس کے لطیف ہونٹوں سے
آرزوؤں کے پھول جھڑتے تھے
آج انمول موتیوں کے عوض
چند آنسو ہیں ، میری آنکھوں میں!

O

اس تیسری نظم میں جس کا عنوان ''نیم شب کا خواب'' سمجھئے، اس میں شاعر اپنے ایک خواب کا ذکر کرتا ہے۔ جس میں وہ اپنی محبوبہ سے ملتا ہے اور وہ اُسے محبت کا طریق اور غرض وغایت بتاتی ہے۔ یہ خواب کوئی ایسا عجیب اور ناقابلِ یقین نہیں کہ کسی اور نے نہ دیکھا ہو بلکہ اس میں تو خواب کی سی کیفیت پائی جاتی ہے۔ وہی خواب کی طرح کا منظر اور وہی خواب میں لانے والی عام باتیں۔ البتہ شاعر نے اپنے خواب کو جس طرح ہمارے سامنے پیش کیا ہے۔ وہ ثابت کرتا ہے کہ یہ خواب ضرور شرمندہ تعبیر ہوا ہوگا، لیکن آہ! ایسے حسین وجمیل اور سُہانے خواب کہاں شرمندہ تعبیر ہوتے ہیں۔ مگر ہمیں اس سے کیا؟ ہم تعبیر کی بجائے خواب کو سمجھنے کی کوشش کیوں نہ کریں؟ سنیئے شاعر اپنا خواب بیان کرتا ہے:

ایک مدت کے بعد کل شب کو
خواب میں اس کو میں نے دیکھا تھا
اور طاؤس کی طرح رقصاں
وہ میرے پاس آکے بیٹھی تھی
مَیں نے محسوس یُوں کیا گویا
عرش سے چودھویں کا چاند یہیں
صُورت مَہ لقا اُتر آیا!

O

O

اُس کی پوشاک سے کہیں افزوں
اس کی نایاب مخملی پاپوش
بے بہا اور خوبصورت تھی!
اس نے اپنے حسین ہونٹوں پر
اپنی انگشت رکھ کے دیکھا تھا
اور اس کی حسین زلفوں نے
مری زرّہ کی سخت کڑیوں کو
کاٹ کے رکھ دیا تھا، شدت سے!

O

اس کے چہرے کے گرد ہالہ تھا
سانپ اُس کے گلے کی مالا تھا
اس کی شعلہ فشاں نگاہوں سے
جگمگاتے ہوئے ستارے بھی
خوف سے چُھپ گئے خلاؤں میں

O

اس نے مجھ سے کہا محبت کے
بارآور شجر سے اے ہمدم!
پھوٹتی ہیں کئی حسیں شاخیں
اور ہر شاخ پر نرالا سا

چہرہ پھول ہوتا ہے!
اس طرح یہ چمن محبت کا
خون ہستی کی آبیاری سے
سارے عالم میں لہلہاتا ہے!!

o

اور اس نظم میں شاعر "میری آواز" کے عنوان سے اپنی ایک دیرینہ آرزو بیان کرتا ہے اور پھر محبت میں ناکامی کا قصہ بیان کرنے کے بعد اپنی حالتِ زار پر محبوبہ سے رحم کی درخواست کرتا ہے۔ ملاحظہ ہو کس قدر سوز و گداز اور محرومی ہے:

ایک دن میں نے یہ کہا اُس سے
اے مری جان ، اے مری ہمدم!
ان پریشان حال زُلفوں سے
مرے قلب و جگر کو اے جاناں
کتنے ٹکڑے ہی کر دیا تم نے
اور ایسے عزیز ٹکڑوں کی
اَب تو پیوستگی کے لئے
عارضوں کی نمی عطا کردو!
کیوں کہ میرے طبیب نے مجھ سے
ایسی اکسیر ہی طلب کی ہے
اور اس کے بغیر ایک گھڑی
آج زندہ میں رہ نہیں سکتا
مرے جینے کی بس دوا یہ ہے!

اور یوں بھی تو سَرد جھونکوں سے
بَرف آلُود بادِ صَرصَر نے
مِرے مضبوط جسم کا اَب تو
خُون تک بھی یہاں جلا ڈالا!

o

اب اس نظم میں جس کا عنوان ''نرمَک کا چشمہ'' ہے۔ شاعر ہمیں ایک ایسے چشمے کی سیر کراتا ہے جو پہلے خشک پڑا تھا۔ پھر وہ موسلا دھار بارش کے بعد پُھوٹ پڑتا ہے۔ اور بہت سے جنگلی کبوتر اس کے کنارے خوشی سے رقص کرتے ہیں۔ دشتِ نرمَک میں بارش کا ہونا بڑی بات ہے۔ اور پھر کسی چشمے کا پُھوٹ پڑنا تو بالکل ناقابل یقین ہے لیکن شاعر ہمیں یقین دلاتا ہے کہ دشتِ نرمَک میں اس نے خود ایک چشمہ دیکھا وہ اپنا مشاہدہ اس طرح بیان کرتا ہے:

ہر طرف بادلوں کا سایہ تھا
چارسُو ایک نشہ چھایا تھا
مَیں نے بڑھ کر یہیں کہا اُن سے
اب تو برسو ذرا خدا کے لئے!
تاکہ نرمک کے خشک میداں میں
ندّی نالے سے آج بہہ نکلیں!
چلتے چلتے جو تھک گیا تھا مَیں
رات اِک غار میں رہا تھا میں
جب کھلی آنکھ صُبح ہونے پر
کچھ کبوتر تھے دُور چشمے پر

پانی پی کر وہ رقص کرتے تھے
اور سُنہری سے جھانجنے اُن کے
اس طرح زور سے وہ بجتے تھے
جیسے نرمک کی ان فضاؤں کو
سازِ قدرت نے کردیا مسحور
اپنے گیتوں سے، اپنے نغموں سے!!

o

اور یہ طویل نظم..... ''ایکبائی کی پریاں'' کے عنوان سے ہے۔ اس میں شاعر ہمیں بتاتا ہے کہ ایک دن وہ اپنی گھوڑی ''مہلو'' پر سوار ہوکر ''ایک بائی'' ''کوہ سُلیمان'' کی بُلند چوٹی پر پہنچا۔ جہاں اس نے ملائک اور پریوں سے ملاقات کی۔ اس داستان میں جہاں انسانی ہمّت کی سربلندی دکھائی گئی ہے وہاں حقیقی زندگی کی طرف بھی توجہ دلائی ہے۔ اس نظم کا آغاز جس طرح شاندار ہے۔ انجام بھی اسی طرح شاندار اور عبرت آموز ہے۔ نظم ملاحظہ ہو:

جب میں اپنی حسین ''مہلو'' پر
جارہا تھا شمال کی جانب
راہ میں کوہ ایکبائی تھا
جس کا مدت سے مَیں فدائی تھا
دل میں آیا کہ اس کی چوٹی پر

چڑھ کے دنیا کی سیر ہی کر لوں!
مَیں نے "مہلو" کو گد گدا کے کہا
ہاں مری جان اس بلندی سے
سیر ہو جائے ، سارے عالم کی!
بس یہ کہنا ہی تھا کہ وہ فوراً
ایک ہی پل میں لے گئی ، مجھ کو
"ایک بائی" کی سبز چوٹی پر
مَیں نے دیکھا کہ برف میں ملبوس
کچھ انگور و انار کے پودے
اپنی عریاں سی ٹہنیوں کے ساتھ
کتنے مغموم ایستادہ تھے
شام ہوتے ہی تیرگی پھیلی
پھر اندھیرے نے سب کو ڈھانپ لیا؟

o

رات اندھیری تھی اور بادل تھے
حوصلے زندگی کے کچھ شل تھے
مَیں اکیلا نہ تھا ، یہاں ہرگز
ساتھ میرے بھی کچھ ملائک تھے
اور شاہین و شاہوار فضا
ہمجلسیں و ندیم تھے میرے

گویا اس کی عظیم چوٹی پر
اک عجیب و غریب منظر تھا
اور کچھ دُور ایک ٹیلے پر
میں نے جلتے ہوئے الاؤ میں
چند پریوں کا رقص بھی دیکھا
گیت بھی ایک گا رہی تھیں وہ
گویا مجھ کو بُلا رہی تھیں وہ
میں بھی ان کی طرف روانہ ہوا
یہ بھی ملنے کا اک بہانہ ہوا
مری قربت تھی ناگوار انہیں
لے اڑی رفعتِ بہار انہیں
اور میں حیراں سا رہ گیا اس دم!
ان پری زادیوں نے ہنس کے کہا
اے بنی آدم و حسیں انساں!
ہم زمیں کے مکیں نہیں پیارے
ہم ہیں پروردہ فضائے بسیط!
جب تمہارا نصیب جاگے گا
پھر مقدر ہمیں ملائے گا
اور ہم آسماں سے آکے یہاں
صاف کرکے تمہارے باطن کو
اک نئی زندگی کریں گی عطا
پھر تمہارے ادھورے سپنوں میں
رنگ تعبیر کا بھریں گی ہم

○

o

اے میرے دوستو یہ مژدہ ہے
میری دنیائے آرزو کے لئے!
اب مُرادوں کے دن قریب ہوئے
گونج اُٹھا ہے نغمہ ءِ شادی
اَب مَیں مَسرور اور شاداں ہُوں
اُس گھڑی کا ہے انتظار مجھے
جب میں دنیا کی ظلمتوں سے کبھی
پاک اور صاف ہو کے جاؤں گا
اور پھر آسمان پر میرا
اِک حسین و جمیل گھر ہوگا!!

o

یہ تو ملک الشعراء جام ڈرک کی بے مثال شاعری تھی، اب ان کی عظیم شخصیت کے متعلق بھی سنئے۔

ملک الشعراء جام ڈرک صرف شاعر ہی نہیں، بلکہ بڑے پایہ کے شہسوار اور مرد میدان بھی تھے۔ چنانچہ انہوں نے میر نصیر خان اعظم کے ساتھ مشہد کی مشہور جنگ میں بھی حصہ لیا اور اپنی بہادری کے جوہر دکھائے۔ اس زمانے کے دستور کے مطابق "دربار قلات" کا ہر رکن گویا ریزرو فوج کا سپاہی تھا۔ اس لئے بھی بلوچی ادب کا بہت زیادہ حصہ رزمیہ شاعری پر مشتمل ہے۔ چنانچہ قاضی نور محمد گنج آبوی کا دیوان "جنگ نامہ" اس بات کا مکمل ثبوت ہے۔ قاضی موصوف خود بھی دہلی کی ایک لڑائی میں میر نصیر خان اعظم کے ساتھ مرہٹوں سے لڑے تھے۔ اسی طرح جام ڈرک بھی مجاہدانہ کردار کے مالک تھے۔

چنانچہ اس سلسلے میں بعض لوگوں کا خیال ہے کہ وہ کچھی کے میدان میں دوران جنگ شہید ہوئے۔ بہر کیف ان کی شاندار زندگی کی طرح موت بھی شاندار ہوئی ان کا مزار لہڑی کے قریب گرگ تنگی کے مقام پر ہے۔

ooo

جام دُرّک

"سمین"

جی سمین بے پرس ءَ بہشتی ءَ
اچ لطیفانی پلّو ءَ کائے
من گل ءِ دیم ءَ میل کتے دوشی
شرگلیمنتے گہورین دیم ءَ
برم ءَ آسیس کتگ مہتوس
بوپ و بالشتان گران بہائیاں
بوئے شہ بیکاں زرتگے وشیں
ہجر من ءَ مویناں جنت ما پاساں
چو کہرانی آہڑیں آساں
پہ وتی دوست ءِ حب و اخلاساں
بیقراراں من نیم شپی پاساں
ماہ رو ءِ پہ وشدلیں نیاداں
حاطر ءَ ہستیں تو روئے گرانیں

o

o

تورو ئے گران و معنئے بازیں
قہر اُملانی گر گرین نازیت
داں دے گارءِ داں دے بازنت
زلفاں ساسارنت دینت جان ءِ
نہہ کناں، نہ، چو دوست ءِ فرمان ءِ
چو اسپر ءِ دیمپان کنان جان ءِ
پہ چابک ءِ چم ءِ دید ءِ پیکاں ءِ
نے دپ ءِ گیرکہ گال کناں روچے
نے من ءِ قدرت ءِ مجال چوشیں
پہ دپ ءِ مہلنج ءِ یہ گال آیاں
نشنگ ءِ دُعاگواں ہما روچ ءِ
وت خُدا مہراں من دلے شیئی
اریکی حیرشہ تنگویں تخت ءِ
سی ئیں سُلطان ءِ سرو بخت ءِ

o

O

بیت روان ءَ چو چاردہی ماہ ءَ
مۓ سروں بی چو اکبریں شاہ ءَ
چہ وتی ڈرچڑیں زبان پری
اچ من ءَ ساقی بن جتیں ہجراں
اگہ ءَ بیداراں شپانباں
سنبگاں تاہیر ءِ روی نوکیں
او بدشکانی لال بے ملکیں؛
مارا تئی لوگاریں سر ءِ سوگند
پرتئی شہد ءَ شکلیں نیاداں
ارمرے گوں کپتوں آنا گلمی
حون بہایاں تئی تنگی دیم ءَ

O

ترجمہ:

اے بادِ صبا، تو جزا اور سزا سے بُلند ہے تُو بہشت
وارد ہے کہ تو، کوچہ دلداراں سے آتی ہے؛
کل رات تو اُس گل اندام سے ملی تھی، تُو اس رُخ زیبا

سے بخوبی آشنا ہے'
اس کی حسین اور دلفریب خوابگاہ کی عنبر فشانی
تیرے ساتھ آئی ہے۔ تو نے اس کی لہراتی زلفوں سے
خوشبو کی مٹھاس لی ہے'
میں یہاں لمحہ لمحہ فرقت کے دکھ اُٹھاتا ہوں جیسے
میرا وجود کبیر' (ایک درخت جس کا شعلہ ناقابل برداشت ہوتا
ہے)
کے بھڑکے ہوئے شعلوں کی سیج پر تپ رہا ہے۔
میں اپنے محبوب کی محبت اور خلوص کا مارا' آدھی راتوں
میں بے چین اور بے قرار رہتا ہوں' میں اس "ماہ رُو"
کے وصل کے لئے ترستا رہتا ہوں'
یہ (وصال) میری ذات کے لئے ایک بہت بڑا احسان
ہوگا' ایک ایسا احسان' جو اپنے اندر احساس کی تہیں رکھتا ہے۔
حسینوں کی ادائیں بھی کیا غضب ڈھاتی ہیں۔ یہ ناز و ادائیں
کبھی کیا ہوتی ہیں کبھی کیا' کبھی تغافل میں نہ ہونے کے برابر
ہوتی ہیں اور کبھی شرارت میں حد سے گزر جاتی ہیں۔ ان
کا بخشا ہوا غم بھی راحت جان ہے۔
ان کا انکار محبوب کا فرمان ہے جن کے
ناز و ادا' جن کی آنکھوں کے تیر کے لئے ہماری جان ڈھال
بن جاتی ہے'
لیکن میں ان کے سامنے کیا اظہار مدعا کر سکوں گا'

مجھ میں تو اُن کے حضور حال کی تاب نہیں مجال نہیں!

میں دست بدعا اس دن کا منتظر ہوں کہ خُداخودان
کے دل میں میری محبت کی جوت جگائے اور وہ طلائی تخت
سے اُتر آئے اور پھر اس سلطانِ بے متاع (شاعر) کا مُقدر
جاگ اُٹھے۔

(اور وُہ) ماہِ چہاردہم کی طرح زینہ بہ زینہ اُترتا آئے اور
میرے سرہانے شہنشاہ حُسن کی طرح براجمان ہو
(اور وُہ) مجھ سے اپنی درگفتاری سے یوں گویا ہو کہ مجھ سے میرے
سال ہا سال کے فراق کے دُکھ جاگتی راتوں کی بے قراریوں
کا حال معلوم کرے
میرے زخموں کو تسکین کا مرہم ملے گا' نیا مرہم!

اے بدخشاں کے لعل بے بہا! ہمیں تمہارے سرِ عزیز کی قسم
کہ تمہارے وصال کی شیرینیوں' تمہارے قُرب کی لذت کیلئے
اگر وقت آیا تو زندگی کی بازی لگانے سے گریزاں نہیں ہونگے
کہ تمہاری طلائی صورت پر میری جان خون بہا کی حیثیت رکھتی
ہے!

o

عیسیٰ ءُ برّی مستانہ

جام دُرّک

رنگ ریزیں خدا جوائیں
دِلّی بادشاہ ءِ دیشوں
تاتار ءِ عنار ءِ ریجار
آں کہ آسناں زرم ءِ کنت
پرچار یک پتے فرزنداں
تیرے مَن تلارے دیم ءِ
دست ءِ پاد گے تیرا بیار
مُندری ءِ ترا پیداراں

حُرمت بی مٹی چیلاے
تپدائیں مَن ءِ لیکووے
ہچی مَن سمندر لاف ءِ
نشتین تسوے تا آپ ءِ
چی مَن سمندر لافیں
گوژد کہ مکرو مسرداریں
پوست آدمی ءِ وریں
عیسیٰ ءِ رنگ سَر واتہ
عرش ءِ قرش ہم چیر واتہ
ورختے پُرسلات ءِ رستہ
ہرکہ ہمسریں لمبائیں
لمبے دوز ءِ دیم پائیں
لمبے مَن بہشتے ءِ لافیں
ہرچی کہ کفے چوژودر
موت ءِ وارتگاں بازءِ سَر
چندی گوستگاں پیغامبر
بی بی فاطمہؓ گُل گوہر
عیسیٰ ءِ یک گورے حیران ءَ
برءِ دیتگے بیوان ءَ
حکل ءِ کتہ مستان ءَ

اشکو ورے ایمان ءَ
چہ چو زیندگ بیتام ءَ
بزّیان دوئی گال آکتہ
عیسیٰ داں دمانے نشتہ
شاہ ءِ قدرتاں ءِ گورتہ
کوہ ءَ کنڈگ داب بیتہ
ہرجاہے چمن گل بیتہ
درختے چہ ڈگارا رستہ
گونشتیں بانگھوے سرزرتہ
نیم روش تپنگیں بُربیتہ
زردیں دیگر ءَ سہربیتہ
درچکے برکتہ ءَ زردیتہ
جوانیں مڑدم وڑدیتہ
یک وارتگا بری ءَ
دوہمی داتگے عیسیٰ ءَ
ہچو گو ہمایان بیتہ
عیسیٰ چوٹو ءَ ہم چویات

○

عیسیٰ اور صحرائی مستانہ

خدائے رنگ ریز پُر جلال ہے'

دلی کے بادشاہ کو میں نے دیکھا'

آہن کار.........'

وہ جو سخت لوہے کو نرم کرتا ہے

چاروں ایک ہی باپ کے فرزند ہیں

پہاڑ کے صاف اور سخت چٹانوں

میں ایک ''تیر'' کھو گیا ہے اُٹھو اور

اس ''تیر'' کو لے آؤ میں تمہیں انگوٹھی

دکھاؤں گا۔ میری مُریدی کی حرمت

تمہیں ملے'

تم مجھے جلدی سے حساب دو!

سمندر کی تہہ (پیٹ) میں ایک

سیپ ہے لیکن وہ پانی سے محروم

ہے پیاسا ہے!

سمندر کی تہہ (پیٹ) میں ایک

چیز ہے جس کا گوشت مکروہ اور مُردار

ہے (حرام ہے) لیکن اس کی کھال

آدمی کی خوراک ہے'

عیسیٰ ریوڑ چراتا' عرش اور فرش

کے چاروں طرف طواف کرتا ہے' اس

نے کیا دیکھا' کہ ایک درخت
پُل صراط پر اُگ آیا ہے اس کی
دوشاخیں ہیں جو ایک دوسرے
کے برابر ہیں' ایک شاخ دوزخ کا
دفاع کر رہی ہے، دوسری شاخ
بہشت کی سمت پھیلی ہوئی ہے'
تم کچھ بھی کرو (تم نہیں روک سکتے)
موت نے کئی سروں کو لقمہ بنایا ہے
کئی پیغمبر آئے' یہاں تک کہ مقدس
خاتون حضرت فاطمہؓ جو پھول کے
موتی کی طرح تھیں' انہیں بھی موت
نے جدا کر دیا۔
عیسیٰ (ریوڑ چراتا) کسی اَور سمت نکل
گیا' ایک بہت بڑا مگر ویران جنگل
نظر آیا اور پھر ایک صحرانورد'
عیسیٰ نے اس مستانہ سے کہا'
اس لق ودق بیابان میں تجھے رزق
کہاں سے ملتا ہے ورنہ تو زندہ کیسے
رہ سکتا؟
صحرانورد گویا ہوا' اے عیسیٰ ! ایک
لمحہ کے لئے رُک' اور بیٹھ جا' قُدرت شاہ

پر نظر رکھ اور پھر اس نے
(عیسٰے نے) شاہ کی قدرتیں دیکھیں
بغیر موسم کے برسات ہونے لگی پہاڑوں
اور غاروں کو جیسے نیند آنے لگی ہو'
چاروں طرف پھول ہی پھول کھلے' (اور
پھر) کھیتوں میں درخت اُگ آئے'
صبح کی ہوا (بادِ نسیم) چلنے لگی' شام
کی زردی سُرخی میں بدل گئی' درخت
پر پھل لگ گئے اور پھل پک کر' زرد
پڑ گئے'
پھل اچھے آدمی کی خوراک بن گئے
ایک پھل صحرا نورد نے کھالیا۔ اور
دوسرا عیسٰیؑ کو دیا گیا'
کاش جیسا حضرت عیسٰیؑ کے ساتھ
ہُوا' مجھ عیسٰیؑ [1] کے ساتھ بھی ایسا ہوتا!

۱۔ عیسٰی' یہاں جام درک نے خود کو عیسٰے کیوں کہا؟ مصنف۔

مُلّا فاضلؔ رند

جیدّ عالم، عظیم شاعر

بلوچی زبان کو شعروادب کی دولت سے مالا مال کرنے میں جن شعراء نے حصہ لیا۔ ملا فاضلؔ رند، ان میں سرفہرست ہیں۔ وہ اپنے دور کے جیدّ عالم اور بلند پایہ شاعر تھے۔

مُلافاضلؔ کی عالمانہ طرزِ نگارش نے نئے استعارات اور نئی تشبیہات سے بلوچی شاعری کا دامن بھر دیا۔ مگر ساتھ ہی ان کی وجہ سے بلوچی زبان میں عربی و فارسی کے بہت سے الفاظ بھی استعمال ہونے لگے' اس سے بلوچی زبان کی انفرادیت کو کچھ صدمہ ضرور پہنچا۔ لیکن اس دور کے علمی ماحول کے اثر کی وجہ سے ایسا ہونا یقینی اور فطری تھا۔ اس کے باوجود مجموعی طور پر ملا فاضلؔ کی شاعری میں شعریت کے ساتھ ساتھ سماجی و سیاسی شعور کا اظہار بھی پایا جاتا ہے۔ اور بلوچی زبان کے شعراء میں رحم علی مری کے علاوہ فاضلؔ کے ہاں بھی یہی کیفیت ہے اور اس کی وجہ سماجی و سیاسی حالات کا ناموافق حد تک موجود ہونا سمجھا جاتا ہے۔

مُلافاضلؔ کی علمیت کا اندازہ یہاں سے ہوسکتا ہے کہ وہ بلوچی کے علاوہ فارسی اور عربی میں بھی شعر کہتے تھے اور بڑے حاضر جواب بھی تھے۔ ان کے چھوٹے بھائی مُلا قاسم بھی اپنے دور کے اچھے شاعر تھے۔ مُلا فاضلؔ (اور مُلا قاسم) کے والد کا نام جاڑش رند تھا۔ وہ قصبہ قاسمی چات جو علاقہ مکران وایرانی بلوچستان کے ایک مشہور سرحدی شہر مند کے قریب واقع ہے۔ وہاں کے رہنے والے تھے۔ مُلا فاضل بھی یہیں پیدا ہوئے اور آسمانِ شعروادب پر طویل عرصے تک ضیاء باری کرنے کے بعد دردِ نیم سری میں مبتلا رہ

کر 1370ھ میں بمقام پشین وفات پائی' مرحوم کے چھوٹے بھائی مُلّا قاسم نے ان کی قبر پر کتبہ نصب کرایا جس میں عربی اور فارسی زبان میں تاریخ وفات وغیرہ کندہ ہے۔

مُلّا فاضل کی شعری خصوصیت کے پیش نظر سب سے پہلے جو بات واضح ہے، وہ یہ کہ انہوں نے روایتی انداز بیان کو ترک کر کے اپنا ایک نیا انداز بیان اور طرز فکر ایجاد کیا اور یہ اسی جدت کا نتیجہ ہے کہ متاخرین نے اس طرز بیان کو اپنایا۔ اس سے پہلے بھی بلوچی شاعری میں ہر لحاظ سے سب کچھ تھا۔ لیکن ایک جدت خیال نہیں تھی مُلّا فاضل اور اس کے ساتھ ہی رحم علی مری اور عزت پنجگوری نے بلوچی شاعری کو جو جدت بخشی، وہ ایک مخصوص رنگ میں مستعمل ہوگئی۔

مُلّا فاضل نے اپنی شاعری میں نئے خیالات اور نئے موضوعات پر کثرت سے طبع آزمائی کی ہے۔ اخلاقی شاعری نعتیہ، شاعری اور قومی شاعری کی بنیاد صحیح معنوں میں انہی کی قوت فکر کی رہین منت ہے۔ قومی شاعری سے متعلق ان کا ایک قطعہ یہاں پیش کیا جاتا ہے اس سے ان کے انداز فکر کا اندازہ ہوسکتا ہے۔

O

عاقلاں سساکنت کہ کشنگ جنپان سرے
پرنشان پیداک نہ بنت مانگوہ برزیں تیمرے
قامیں راجان نہ مٹنگ یک کماشیں مسترے
نہ نصیب داری پشت ء قومیں لشکرے

O

اے عقل والو دیکھو کہ آج مٹی کے ڈھیر
میں بھی قوت آگئی ہے
لیکن افسوس کہ تمہارے پہاڑ جیسے بہادر

اور جری نوجوانوں میں کسی کا بھی نام ونشان
نہیں،
آج کوئی رہنما بھی نہیں رہا، جو اس قوم کی
صحیح رہنمائی کرے!

تاریخ شاہد ہے کہ یہ قومی جذبہ متاخرین شعراء کے لئے بہت ہی مفید ثابت ہوا۔ ملا فاضل کی پیدائش سے متعلق ایک روایت ہے کہ ایک رات ان کی والدہ نے یہ عجیب خواب دیکھا کہ ان کے دونوں ہاتھوں پر دو بڑے لعل ہیں، جن کی روشنی سے رات روشن ہوگئی ہے۔ اس کی تعبیر ایک بزرگ نے یہ بتائی کہ تمہارے بطن سے دو نامور فرزند پیدا ہونگے جو اپنے علم سے جہالت کی تاریکی دور کرینگے' چنانچہ ایسا ہی ہوا ملا فاضل اور ملا قاسم نے اپنے دور میں علم وادب کے ذریعے جہالت کا سدِ باب کیا اور دنیائے ادب میں نئے چراغ روشن کیئے۔

ملا فاضل کا سن وفات (ان کی قبر کے کتبہ کی تحریر کے مطابق) ہجری 1370ھ ہے اس حساب سے اسے فوت ہوئے آج ایک سو اٹھارہ سال ہوگئے ہیں' لیکن وہ اپنی شاعری کے ذریعے اور اپنی عالمانہ شخصیت کے لحاظ سے ہمارے لئے زندہ ہے اور اسی طرح ہر دور میں زندہ رہے گا!

ملا فاضل رند

چند بیت ابیات

کن کہ سبحان الذی اسریٰ یات کناں — گوہرءِ بہر دھندہ وقف آں ذات کنان
جاں ستان میل ءِ وطن باب ءِ کاوات کناں — بلکہ گوں راہ نما خضرءِ ملاقات کنان
ذکر حق علم ءِ یقین سِرّ و خفیات کناں — در جہاں نور ءِ تجلی را کرامات کناں
نعت سردار ءِ نبی ءِ مدح ءِ صلوات کناں — صد درود ءِ صد سلام پیشکش ءِ سوغات کناں

آہ ءِ سرد ءِ زندگی تشویش ءِ ہیات کناں   صد خطر از دوزخ ءِ کرءِ علامات کناں
پہلوانِ ربّ داد من چند ابیات کنان   کل حکایتیں زبان ءِ پیرءِ پرگوات کناں
نہ دِل ءِ برزندگی روچاں کشالات کناں   قصہ ءِ نوکیں پہ گنڈیگاں جزنانت کناں

امرءِ شاہیں کردگارے چیرءِ سر بسیار کنت   مردءِ نامردے سپاہی والہ ءِ چمدار کنت
پیرمردیں عاجزءِ اندر جہاں پادار کنت   نوجوانیں ،نوگلیں، نوخواستگاں اوگار کنت
دردمنداں تنگدست ءِ جان سخت بیمار کنت   بورءِ واجہان گداءِ صد پیادگ سوار کنت
خلقے سوچیت ءِ ہم نوکیں دِہ ءِ کلدار کنت   بیگناہ ءِ رابدستِ ظالماں سنگسار کنت
بادشاہاں سرنگوں ءِ ناکساں سردار کنت   درغم ءِ شدت قلات ءِ واجہار اخوار کنت
طوطیاں اندر کنارءِ کرگزاں خاکسار کنت   گر ہیت قارون مثال چو منجل ءِ ڈاتار کنت

عاقلاں سہ کن ات کہ کشتہ مُچپاں سرے   پر نشاں پیداگ نہ بنت مات کوہ بُرزیں تیمرے
ہم جواب انت ولیہ ءِ گوں زرخریدیں نوکرے   اسپ تازی ءِ چہ شرتر کم نسب واریں حرے

کپتگنت از ترہ وتاباں چیشی خونخواریں نہنگ   گردءِ گولاں حملہ کنت بے کشاریں گورءِ لنگ
خوارءِ حیران وا سیرنت گریشک ءِ شیرءِ پلنگ   کنگ ءِ کتاں گمسالیں تو لگ ءِ روبہ بجنگ
بیت نزور اسلام ہم کفار کنت گرداب تنگ   تیغ بے جوہر دراتگگ پرشاہاں نام ءِ ننگ
پرنبی ءِ نیک پاکاں گوشگنت بُرزیں اٹنگ   تخت ءِ اسکندر گجاشت کیدوءِ دکا ڈی فرنگ
اسلم ءِ جمشید کیانی دود ءِ تیمور شاہ لنگ   جاں رودیں تن نگنت چچ کارر ا تیغ ءِ تفنگ
سنجرءِ سلطان ءِ ثانی بہمن ءِ دیورءِ بشن   در دِل ءِ نقش انت ملانی برتگیں داغ عدن
ہوش بکن فاضل کہ لس انگو نمانیت برقرار   ٹوشگے فکرءِ بکن کہ کارواں چیگ تیار

ترجمہ:

اور میں جو اُس ذات پاک کو (جو معراج بخشتا ہے راتوں کو) یاد کرتا ہوں
دراصل لعل و گہر کا بخشنے والا وہی ایک تو ہے!

میری جان چھن کر آسمان کی پہنائیوں کی طرف عازم ہے شاید کوئی خضرؑ راہ نما
سے میری بھی ملاقات ہو جائے۔ حق کا تذکرہ میں اعلانیہ اور مخفی ہر صُورت میں کرتا ہوں
تاکہ علم کی روشنی کا شف کرامات ہو سکے۔

نبیوں کے سردار کی مدحت اور درود، میرا ورد ہے یہی صد درود وسلام ہی تو میرا
تحفہ ہے زندگی کی برائیوں (گناہ) پر میں افسوس اور تشویش کا اظہار کرتا ہوں' دوزخ کی
آگ (طمع دُنوی) سے سینکڑوں خطرے محسوس کرتا ہوں (یعنی طمع دُنوی علامت دوزخ
ہے) اے رب داد گو یے! میں کچھ بیت موزوں کرتا ہوں' میری زبان (حقیقت کے بیان
کرنے میں) سے پھول جھڑتے ہیں۔

میں اپنے دل کو زندگی کی تگ وتاز کی نذر نہیں کرتا۔ اس لئے آئندہ نسلوں کے
لئے ایک داستان تازہ کر جاتا ہوں۔

دیکھو! اللہ تعالیٰ کی عجیب بادشاہی ہے اور یہ کیسے نشیب وفراز کی آئینہ دار ہے
مردوں کو بھگوڑوں کا محتاج اور ان کے رحم وکرم پر ڈال دیتا ہے۔

بوڑھے اور ضعیفوں کو اس جہان میں زیادہ استحکام حاصل ہوتا ہے اور نوجوان اور
نونہالوں جن کے دل میں ہمدردی ہے وہ تنگدست ہیں' بیماری ہمیشہ سخت جانوں کے حصے
میں آتی ہے۔ سوار کو پیادہ اور پیادے کو سواری بخشتا ہے۔

کسی علاقے کو جلا کر بھسم کر دیتا ہے اور کہیں نئے گلزار کھلا دیتا ہے (کبھی)
بیگناہوں کو ظالموں کے ہاتھوں سنگسار کراتا ہے۔ تاکہ ان ظالموں کے دلوں کا امتحان
کرائے کہ وہ خدا سے کتنا ڈرتے ہیں۔

بادشاہوں کو سرنگوں اور بے چاروں کو سروری عطا کرتا ہے اور جنہوں نے سنگین حصار
میں شدائد کے خوف سے پناہ لی ان پر بھی غم کی یلغار کراتا ہے۔
طوطیوں (نیکوں) کو پاس بُلاتا ہے اور کرگسوں (بُروں) کو خاکِ بسر کردیتا ہے چاہے
دولت کے لحاظ سے قارُون ثانی ہی کیوں نہ ہو، دیگچی کی طرح آگ سے امان نہیں پاسکتا۔
اے عقلمندو! عبرت کرو، دیکھو چھوٹی چھوٹی پہاڑیوں (رذائل) نے بھی
بلندیاں پائی ہیں، اور نشان کے لئے بھی کوئی اونچی چٹان اور اونچا پہاڑ (اشراف) نظر نہ
آتا، زرخرید غلام بھی اب اپنے آقا کے مقابلے میں ڈٹ جاتا ہے۔
اب وہ خونخوار مگرمچھ (بہادر دلیر) بھی پہلی جیسی دلاوری سے رہ گئے ہیں، حتیٰ
ان کے شکار اپاہج اور کمزور لے اُڑتے ہیں۔
جنگل کا شیر اور چیتا بھی اب پہلے سے آشفتہ ہوکر رہ گیا ہے، اس لئے کہ گیدڑ
اور لومڑیاں ان کے چنگلوں سے لڑکر شکار لے جاتے ہیں۔
ہاں اسلام کمزور ہورہا ہے، اور باطل کا حلقہ تنگ ہورہا ہے (یعنی حق کو باطل دبا
ہے) کیا اب نام ونگ کی جوہردار تیغ میں وہ کاٹ نہیں رہی۔
انبیاءؑ اور نیکوں کے لئے ہمیشہ امتحان کی بلندی رہی ہے (دیکھو) سکندر کا تخت
کہاں گیا؟ اور کید اور کاؤسی کے کیا معنی ہوئے؟
اسلم، جمشید، کیانی کا دور کہاں گیا؟ رودی تن جیسا نامور (پہلوان) اب کہاں
جس پر بندوق اور تلوار کا اثر نہیں ہوتا تھا۔
سنجر وسلطان، مانی بہمن ویورویشن، ان کی عظمتیں دلوں پر تو نقش ہیں، مگر صرف
ایسے داغ کی طرح جو جنت تک ساتھ ہو..... فاضلؔ! ہوش میں آؤ، کون ہے جو زندہ
جاوید رہا ہو، ہاں نوشتہ آخرت کی فکر کرو، کیونکہ کاروان بس چلنے ہی والا ہے!!

O

عزت پنجگوری

رومان پسند شاعر

عزت پنجگوری بھی اپنے دور کا شبہ مُرید گزرا ہے' اسے بھی محبت میں ناکامی نے اپنے زمانے کا بڑا شاعر بنا دیا۔ اس کی شخصیت' محبت کی مرہون منت ہے اور فن بھی محبت کے آستانے پر جبیں سائی کرتا ہوا دکھائی دیتا ہے' مہرک ہی اس کی شخصیت اور فن کا محور ہے اور مہرک کی محبت زندگی کا حاصل' لیکن جب اسے مہرک ملی نہ اس کی محبت' تو وہ بلند پایہ شاعر بن گیا۔

عزت' مُلا فاضل' کا ہمعصر تھا' لیکن عمر میں اس سے چھوٹا تھا' اس دور سے کچھ پہلے کا ذکر ہے' کہ علاقہ سرباز (ایرانی بلوچستان) کے ایک گاؤں پیروان میں سالک ہی شخص کے گھر میں ایک حسین لڑکی پیدا ہوئی' ماں باپ نے اس حسین بچی کا نام مہربانو رکھا۔ بچپن ہی میں مہربانو جسے پیار سے گھر والے مہرک کہتے تھے' اپنے چچا کے لڑکے سے منسوب کر دی گئی اور جب مہرک جوان ہو گئی تو اس کے بے مثل حُسن کی شہرت دور دور تک پھیل گئی اور قریب قریب ہر محفل میں اس کے حُسنِ خداداد کا تذکرہ ہونے لگا۔

ایک طویل عرصے بعد جب ایک دن عزت پنجگوری اور مُلا فاضل کی ایک جگہ ملاقات ہوئی تو شعر و شاعری کا دور چلا' مُلا فاضل نے مہرک کے حُسن بے مثال کی تعریف میں قصیدہ کہا' عزت نے بھی نمونتہً اپنے کچھ تازہ اشعار سنائے اور پھر اس نے فاضل سے مہرک کے متعلق تفصیلات معلوم کیں' مُلا فاضل نے مہرک کے حُسن و جمال میں تعریفی الفاظ کہنے کے بعد اس کے گھر کا پتہ تک بتا دیا' عزت نے جب مہرک کو اپنانے کا ذکر کیا

تو مُلا فاضل نے اسے اس ارادہ سے منع کرتے ہوئے آگاہ کیا کہ مہرک اپنے چچازاد سے منسوب ہے اس لئے وہ اسے اپنانے کا خیال ترک کردے۔ مگر عزت پر گویا مہرک کے حُسن کا جادُو چل گیا تھا' اس نے ملا فاضل سے اجازت لی اور بہت سمجھانے کے باوجود مہرک کے گاؤں کی طرف چل پڑا۔

کہتے ہیں کہ جب طویل مسافت کے بعد عزت' مہرک کے گاؤں پیردان میں پہنچا تو وہاں کے لوگوں نے اس کی بہت خاطر مدارت کی۔ ایک روز جب عزت گاؤں کی ندی کے کنارے ٹہل رہا تھا' اسے چند نوجوان لڑکیاں دکھائی دیں جب وہ اس کے قریب سے گزریں اس نے ایک مہ جبیں کو ان کے جھرمٹ میں دیکھا وہ سمجھ گیا کہ وہ مہرک ہی ہے، جس کے حُسن نے اسے اتنے دور کا سفر کرایا وہ اسے دیکھ کر اتنا محو ہوا کہ تن بدن کا ہوش نہ رہا۔ اور جب یہ نظارہ آنکھوں سے اوجھل ہوگیا عزت کو ہوش آیا۔ اس واقعہ کے بعد اس نے مہرک کے حسنِ جہاں تاب کی تعریف میں کچھ ایسے پُرسوز گیت تخلیق کئے جو گاؤں کے ہر نوجوان کی زبان پر جاری ہوگئے۔ مہرک کے والدین کو بہت دکھ ہوا کہ ایک دیوانے شاعر نے ان کی چہیتی بیٹی کو رُسوا کردیا' چنانچہ انہوں نے اسے بلا کر سمجھایا مگر وہ کسی طور پر نہ مانا بلکہ اس نے مہرک سے شادی کی آرزو کا ذکر بھی کیا۔ مُہرک کے والد نے اسے اس موقعہ پر صورتحال سے آگاہ کردیا کہ مہرک اپنے چچازاد سے منسوب ہے۔ لیکن عزت اپنی ضد پر اڑا رہا۔ بالآخر مہرک کے باپ نے بچاؤ کے لئے چال چلی اور مہرک کو حاصل کرنے کے لئے یہ شرط عائد کردی کہ وہ بیش قیمت کپڑے اور زیورات لے آئے مہرک اسے مِل جائے گی..... نوجوان عزت نے فوراً اس شرط کو قبول کرلیا اور خوشی خوشی پیردان سے روانہ ہوا۔

روایت ہے کہ اس کے بعد ایک قافلہ آیا جس کے سردار نے مہرک کے حُسن جہاں سوز کی اس قدر تعریف کی کہ مہرک کو اس کی نظر لگ گئی اور وہ کچھ روز بعد اس قدر

بیمار ہوئی کہ اس مرض سے جانبر نہ ہو سکی اور ادھر عزت ایک طویل مدت کے بعد بالآخر مال و دولت حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ اس نے خوبصورت کپڑے سلائے اور قیمتی زیورات بنا کر مہرک کے گاؤں پیروان کی طرف روانہ ہوا' وہ راستے میں خوشی کے گیت گاتا رہا وہ خوش تھا کہ اب اس کی مہرک اسے مل جائے گی اور وہ اسے ہمیشہ کے لئے اپنا لے گا لیکن جب طویل مسافت کے بعد وہ پیروان میں داخل ہوا تو اس وقت اسے دور سے ایک جنازہ آتا ہوا دکھائی دیا۔ گاؤں کے لوگ ماتم کرتے ہوئے بڑھ کر ایک بزرگ سے دریافت کیا' جواب میں اس معمر شخص نے اسے بتایا کہ یہ جنازہ سالک کی چہتی بیٹی مہرک کا ہے۔ یہ سنتے ہی عزت کے دل پر جیسے بجلی سی گری' اسے یقین نہیں آیا کہ مہرک ہمیشہ کیلئے موت کی آغوش میں سو گئی ہے۔ لیکن اس نے مہرک کے باپ کو زار و قطار روتے ہوئے دیکھا تو اسے یقین آ گیا کہ مہرک واقعی مر گئی ہے' کچھ لمحے وہ خاموش ماتمی جلوس کو دیکھتا رہا اور پھر جیسا کہ اسے ہوش آ گیا۔ اس نے بیش بہا زیورات اور کپڑوں کو پھینک دیا اور پاگلوں کی طرح چلاتا ہوا جنازے والوں کے ساتھ شامل ہو گیا' وہ روتا ہوا مہرک کے جنازے کے ساتھ ساتھ چل رہا تھا۔

قبرستان میں اس نے مہرک کو اپنے ہاتھوں سے منوں مٹی کے ڈھیر کے نیچے دفنا دیا۔ لوگ مہرک کو سپرد خاک کر کے چلے گئے لیکن عزت وہیں رہ گیا اور کئی روز تک وہاں آنسو بہاتا رہا۔ پیروان کے لوگوں کو اس پر بڑا ترس آتا وہ اسے صبر کی تلقین کرتے لیکن عزت پر ان کی باتوں کا کوئی اثر نہ ہوتا۔

آخر لوگوں کو ایک دن معلوم ہوا کہ عزت مہرک کی قبر کو آخری الوداعی بوسہ دے کر ہمیشہ کیلئے پیروان سے چلا گیا ہے' اس نے صحرا نوردی اختیار کر لی اسے گاؤں کے لوگوں نے پھر کبھی نہیں دیکھا' البتہ اس نے ملک ملک کی خاک چھاننے کے باوجود مہرک کا ثانی کہیں نہیں پایا۔ اسے مہرک سی کوئی صورت نظر نہیں آئی' جسے دیکھ کر کچھ تسکین

ہوتی۔ اس لئے وہ عمر بھر اس حسرت کا ماتم کرتا رہا۔

سر باز شہر پیر دان
رفتوں تمام ءِ ایران
ٹکّر گدائی پنڈاں
چُوں کابلی فقیراں
ہر جا رواں نمیراں
نیست انت دل ءَ را درمان
من مہرکؔ ءَ نہ گِنداں
باگ ءِ گُلے بسنداں

o

ترجمہ:۔

سرباز کے شہر پیردان اور تمام ایران
کی سیر کی'
کابل کے فقیروں کی طرح در در کی گدائی کی
افسوس میں جہاں بھی گیا مجھے موت نہیں آئی
اور میرے دل کو بھی قرار نہیں آتا' اب میں مہرکؔ
کو کبھی نہیں دیکھ سکوں گا۔
کاش! میں باغ دنیا کا یہ حسین پھول
حاصل کر سکتا!!

ooo

بالاچ

بلوچی زبان کا رزمیہ شاعر اور تاریخی کردار

بالاچ بن حسن گرگیج کی رزمیہ شاعری بلوچی ادب میں اہم مقام رکھتی ہے، وہ بلوچی ادب کے رزمیہ شاعر کے علاوہ بلوچوں کی قدیم تاریخ کا ایک نمایاں کردار بھی ہے۔ انسانی عزت وناموس اور مظلوم کی حمایت کے لئے وہ زندگی بھر برسرِ پیکار رہا۔ اسے اپنے معاشرہ کی اُن اخلاقی قدروں کی حفاظت کرنی پڑی جو ایک بلوچ کی حیثیت سے اس پر عائد ہوتی تھیں، اس کا بھائی دودا خان بھی انہیں اخلاقی قدروں کی حفاظت کے لئے حجلہ محروسی کو چھوڑ کر آگے بڑھا اور ایک مظلوم بیوہ ''سمّی'' کی حمایت میں اس دور کے ایک ظالم سردار بیورغ پُڑ سے نبرد آزما ہوا اور بہادری سے لڑتا ہوا شہید ہوگیا۔

بلوچی روایت ودستور کے مطابق اس کے بعد بالاچ پر دودا خان کا بھائی ہونے کی وجہ سے اس فرض کی تکمیل کا بوجھ آن پڑا چنانچہ کم سن ہونے کے باوجود وہ تیر کمان اور تلوار سنبھال کر گھر سے نکل پڑا۔ بیورغ پُڑ سے مظلوم سمّی کے مال مویشی چھیننے اور اس کی عزت وناموس بچانے کیلئے اسے دَر دَر کی خاک چھاننی پڑی بالآخر ایک دراز مدت بعد اسے ایک دن موقعہ پاکر ظالم بیورغ پُڑ کو للکار کر کہا:

o

من گوں بداں بنچو کھناں
دودا تھئی جوریں دژمناں
بانز گوں کپوتی ولہراں
گرمیں لوار گوں چلڑواں
ہوک کنت گوں ازء نان ء
بزگوں کبیریں ڈھنگراں
گرگ گوں مزار چیڑیں جڑاں
میدا' گوں ماہی ء کھناں!

o

ترجمہ:۔

میں بُرائی کرنے والوں کے ساتھ یوں پیش آؤنگا' میں دودا پر ظلم کرنے والوں کے ساتھ وہ سلوک کرونگا' جو باز کبوتر کے ساتھ کرتا ہے' جو تیز لُو چشمے کے ساتھ کرتی ہے۔
جسطرح سئور فصلوں کو تباہ کرتا ہے' جیسے بکریاں درخت کی کونپلیوں کو چٹ کرجاتی ہیں' جو سلوک بھیڑیا اونٹنی کے بچے کے ساتھ کرتا ہے' اور جیسے مچھیرا مچھلی کے ساتھ!

o

یہ واقعہ ایک اخلاقی وسماجی فرض کی ادائیگی کی بنیاد پر ظہور پذیر ہوا' مظلوم کی حمایت اور اخلاقی قدروں کے تحفظ کا ایک شاہکار اور بلوچی فن شاعری کا حسین مرقع ہے' واقعہ کی تفصیل کچھ اس طرح ہے کہ قبیلہ پُژ کی ایک خاتون سَمّی کا خاوند اچانک فوت ہوجاتا ہے اور وہاں کا ایک ظالم سردار بیورغ پُژ ایک دن اس کے مویشی ہانک کر اپنے ہاں لے جاتا ہے وہ بیچاری سردار سے اپنے حق کا مطالبہ کرتی ہے' مگر وہ اسے مال مویشی واپس دینے سے انکار کردیتا ہے۔ چنانچہ مظلومہ' قبیلہ گرگیج کے ایک معزز نیک سیرت شخص دوداخان گرگیج کے ہاں پہنچ جاتی ہے۔ اور اس کے سامنے اپنی بپتا سنا کر بیورغ سے مویشی واپس حاصل کرنے کی درخواست کرتی ہے۔ دوداخان اسے یقین دلاتا ہے کہ وہ ظالم بیورغ سے جلد ہی اس کے مویشی لادے گا۔

دوداخان نے اس غریب عورت کو اپنے گھر میں پناہ دی اسے اپنی والدہ کے سپرد کیا اور تسلی دی کہ وہ جان پر کھیل کر بھی اس کے مویشی لادے گا۔ چنانچہ اسی دن دودا خان ماں سے اجازت لے کر بیورغ کی تلاش میں روانہ ہوا' دوسرے روز دوداخان سردار بیورغ پُژ سے ملا اور اس سے غریب سَمّی کے مویشی طلب کرنے لگا۔ ظالم بیورغ نے مویشی واپس دینے سے صاف انکار کردیا۔ جب وہ کسی طرح نہ مانا تو دودا نے اسے بتایا کہ وہ مویشی واپس لے کر ہی جائے گا۔ بیورغ کو دودا کے اس چیلنج پر غصہ آگیا وہ دودا سے لڑ پڑا دونوں دیر تک لڑتے رہے بالآخر بیورغ نے دھوکے سے دودا کو مار ڈالا۔

جب یہ خبر بالاچ تک پہنچی تو وہ سردار بیورغ پُژ کے پاس آیا کچھ دیر تک دودا کی لاش پر آنسو بہاتا رہا۔ پھر بھائی کی لاش کے قریب کھڑے ہوئے ظالم بیورغ کو للکار کر کہا' بیورغ! میں اپنے بھائی کے انتقام کے لئے نہیں' مظلوم سَمّی کا حق دلانے کے لئے تم سے ضرور لڑوں گا' بیورغ نے اس بات کو دیوانے کی بڑ سمجھ کر طنزاً کہا'' تم ابھی چھوٹے ہو بڑے ہولو پھر میں کوئی دور نہیں''!

آخرکار قبیلے کے لوگوں کی مدد سے بالاچ اپنے بھائی کی لاش کو وہاں سے اٹھا کر گھر لایا' قبیلہ بھر نے ماتم کیا بعد میں اس نے ماں سے سارا واقعہ بیان کیا اس قابل احترام خاتون نے نہایت ہی حوصلہ مندی سے اپنے بڑے بیٹے دودا خان کی موت کا صدمہ برداشت کیا لیکن کچھ دیر بعد اس نے بالاچ سے کہا اب تمہارا کیا ارادہ ہے؟ بالاچ نے کہا' ماں دودا اگر مر گیا تو کیا ہوا؟ خدا اسے جنت نصیب کرے' میں انشاء اللہ بہن کی کے مویشی ظالم بیورغ سے چھین کر لادوں گا'..... لیکن تم تو چھوٹے ہو بیورغ سے کیسے لڑو گے؟ ماں نے مغموم ہو کر کہا' بالاچ کچھ دیر خاموش رہا اور پھر سینہ تان کر کہنے لگا' ماں! انشاء اللہ میں اپنا قول پورا کروں گا' معمر خاتون کی آنکھوں میں آنسو آ گئے اس نے دعا کی کہ اللہ تعالیٰ تمہیں اس نیک مقصد میں کامیاب کرے۔

ایک رات وہ چپکے سے گھر سے روانہ ہوا اسے معلوم تھا کہ ماں اس کو مشکل ہی سے چھوڑے گی' اسے بھی ماں سے بے حد محبت تھی' مگر ادھر فرض کی انجام دہی بھی تھی اس لئے وہ اپنے فرض کو جو اس کے بھائی دودا نے وراثت کے طور پر اس کے سپرد کیا تھا' پورا کرنے کیلئے گھر سے نکل پڑا..... وہ گزر بسر کے لئے مزدوری کرتا اور بعد میں تیراندازی اور تلوار چلانے کی مشق بھی کرتا' آخر دس سال بعد جب وہ توانا اور جوان ہوا تو ایک دن وہ اپنے پرانے ساتھی نخیفو کے ساتھ ظالم بیورغ کی گوشمالی کے لئے نکلا اسے خوشی ہوئی کہ وہ آج اپنے فرض کی تکمیل کے قابل ہوا ہے۔ بیورغ اپنے گاؤں کے قریب تین چار ساتھیوں کے ساتھ بیٹھا خوش گپیاں کر رہا تھا' بالاچ نے انہیں دور سے للکارا..... پہلے تیروں سے مقابلہ ہوا جس میں بیورغ کے ساتھ مارے گئے' پھر بیورغ' بالاچ کے مقابلے پر آیا۔ اس نے سمجھا کہ یہ دبلا پتلا نوجوان مقابلے کی تاب نہیں لا سکے گا۔ لیکن جب تلوار بازی کا مقابلہ ہوا' تو بیورغ کو دودائی قوت کا اندازہ ہوا ابھی وہ اس سوچ میں تھا کہ کس طرح اس سے جان چھڑائے کہ بالاچ نے بڑھ کر ایک بھرپور وار کیا اور بیورغ

وہیں ڈھیر ہو گیا۔ بالاچ اپنی کامیابی پر خدا کا شکر بجا لایا اور پھر اپنے ساتھی نخیفو کو ساتھ لے کر بیورغ کے گھر سے تمی خاتون کے مویشی ہانکتے ہوئے کئی دنوں بعد اپنے گھر پہنچا۔ یہاں اس نے اپنی ماں کو نہیں دیکھا' دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ وہ بیمار رہ کر مر گئی چنانچہ تمی کے مویشی اس کے حوالے کر کے بالاچ ماں کی قبر پر گیا۔۔۔۔ وہاں اس نے روتے ہوئے کہا' ماں! میں نے اپنا فرض ادا کیا' اسے ایسے محسوس ہوا کہ جیسے اس کی ماں کہہ رہی ہے۔۔۔۔ بہادر بالاچ! تم نے اپنا فرض ادا کیا' مظلوم کی حق رسی کرادی' میں تم سے خوش ہوں وہ یقیناً خدا بھی تم سے خوش ہوا"!!

یہ داستان بلوچی جذبہ غیرت و حمیت کی ایک تاریخی داستان ہے اور اسے بالاچ ہی نے ایک شاعر کی حیثیت سے نظم کیا ہے' وہ اس داستان کا اہم کردار بھی ہے اور ساتھ ہی مورخ و شاعر بھی' اور یہ حقیقت ہے کہ وہ داستان یا قصہ بہت ہی دلچسپ ہوتا ہے جن میں داستان گو خود بھی اس کا ایک کردار ہو بالاچ کی شاعرانہ عظمت کا وش کا اس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ مظلوم کی حمایت کی یہ داستان جو قدیم بلوچی دور کا ایک حصہ ہے۔ واقعات کی صحیح عکاسی کرتی ہے۔ شاعر نے اسے نہایت ہی خوش اسلوبی سے بیان کیا ہے۔ بالاچ کی شاعری میں تشبیہات مثالیں اور استعارے زیادہ ہیں اور اس نے انہیں مناسب طور پر استعمال کیا ہے۔

اس منظوم داستان کے ایک حصے میں وہ بلوچوں کی سادگی اور عظمت کی تعریف کرتے ہوئے کہتا ہے:۔

آف بہو کیں چشمہ بنت

کوڑی پھیشیں کنڈل انت

تشیں چہ کرکاوگ انت

O

وہ بہتے ہوئے چشمے کا پانی پیتے ہیں۔
پھیش (مرری) کے پتے ان کے آبخورے ہیں۔
خودرو گھاس کے فرش اُن کے بیٹھنے کی جگہیں ہیں۔
سخت زمین اُن کا گدیلا ہے۔

O

اسی طویل نظم میں وہ آگے چل کر عجیب ونادر تشبیہیں اور مثالیں دیتا ہے یہاں اس کا فن ان تشبیہات سے عُروج پر دکھائی دیتا ہے وہ اپنے سادہ لوح عوام کے احساسات کی ترجمانی کرتے ہوئے کہتا ہے:۔

بورے سویدیں چھبو انت
مے بچھ گشینیں گونڈل انت
مے زامات شلیں خنجر انت
مے برات تلاریں اسپر انت
مے عاریف مزن تاچیں لڑانت

O

ہماری سواریاں ہماری چپلیاں یعنی جوتے ہیں'
عمدہ تلواریں ہماری اولاد ہیں۔
تیز خنجر ہمارے داماد ہیں۔
چوڑی ڈھالیں ہمارے بھائی ہیں۔
چوڑے پھل والی تلواریں ہمارے بزرگ ہیں۔

بہادرانہ جرات اور غیرت مندی بڑی چیز ہے وہ ان اوصاف کو سراہتا ہے اس لئے وہ اپنے بہادروں کی حوصلہ افزائی کرتے ہوئے انہیں اس طرح خراج تحسین پیش کرتا ہے۔

انبارش بے ہوشیں گرانت
بُوزیں ہشی اش بادگر انت
آمڑوکہ حوناں گرانت
واب اش تلارانی زہ انت

O

بُلند چٹانیں اُن شیر دل بہادروں کیلیے
انمول خزانے ہیں'
جو جوان ہمت اپنے خاندان کے ناموس
اور خُون کا انتقام لینا چاہتے ہیں'
وہ اُن چٹانوں کی تیز نوک چوٹیوں پر
سوتے ہیں۔

اس قطعہ میں بھی اس کا مدازہ وہی ہے' تشبیہ کی جھلکیاں بھی ہیں اور تحسین و حوصلہ افزائی بھی۔

دشمن کتنا طاقتور ہے اور اس کے پاس کس قدر لشکر ہے؟ مسلمان اس کی پرواہ نہیں کرتا' حق کا یہ سچا پرستار صرف اپنی قوت بازو اور اللہ کی ذات پر یقین رکھتا ہے اور یہ یقین اسے کامیاب وکامرانی بخشتا ہے۔ بالاچ اسی یقین قوت ایمان سے سرشار ہو کر اپنے بہادروں کو اپنی مثال دیتے ہوئے بتاتا ہے:

نغی تو داتھم نہ جگے
بدی تھم بور ء شیرزی
صدی دہ ایں گوں بورے نے
بزی و گران لشکرے نئے
ء سر دیسی پروتھی من
دوڈاں بشامی چھو شف ہر
ء مرغ چہ کھایاں بنداں

O

میں کبھی گیدڑ کی سی لڑائی نہیں لڑا، بلکہ
میں نے ہر مرتبہ دشمن کو شیر کی طرح
پچھاڑا ہے؛
میرے پاس کوئی ہزاری گھوڑا نہیں، اور نہ
ہی میرے ساتھ کوئی لشکر ہے، بلکہ میں
تنہا، ہر رات ساون کے بادلوں کی طرح
گرجتا ہوں؛
اور گھٹاؤں کی مانند میدانِ جنگ میں آتا
ہوں؛

O

بالاچ کی شخصیت اور شاعری کا موازنہ کرتے وقت یون معلوم ہوتا ہے کہ اس کی شخصیت اس کی شاعری سے زیادہ باوقار اور دلچسپ ہے۔ اپنے طور پر وہ سماجی وتاریخی کردار ہے اور اپنے دور کا داستان طراز بھی' اور پھر وہ ایک شاعر کی حیثیت سے اپنے عوام کے خیالات وجذبات کی ترجمانی کرتے ہوئے انہیں زندگی بھر جدوجہد کی تلقین بھی کرتا ہے' اس طرح گویا وہ بیک وقت اپنی قدیم تاریخ کا ایک اہم کردار' اپنے دور کا داستان طراز' اور اپنے زمانے کا نامور شاعر ہے۔

بالاچ اپنے وطن میں ''سنگ سیلا'' (علاقہ بگٹی) کے قریب ایک جگہ دفن ہے' اس کا مدفن گمنامی کی حالت میں ہے' لیکن اس سے کوئی فرق نہیں پڑا کیونکہ اس کی شخصیت اور فن نے اسے شہرتِ دوام بخش دی ہے' اور یوں بھی اس کی شخصیت گوناگوں اوصاف کی حامل تھی' وہ اگر شاعر نہ ہوتا تو بھی وہ اپنے دور کے ایک جری سپاہی اور غیور شخص کی حیثیت سے تاریخ میں زندہ رہتا اور آج بھی وہ بلوچی تاریخ ادب کا ایک اہم کردار اور انسانی اقدار کی سلامتی کا حامی گردانا جاتا ہے۔ وہ ہمیں بتاتا ہے کہ مظلوم کی حمایت کیلئے ظالم سے ٹکرا جانا چاہئے اور اپنی قومی عزت وناموس کے لئے مرمٹنا بڑی سعادت ہے۔ چنانچہ وہ زندگی بھر اس مقصد کی تکمیل میں برسرِ پیکار رہا۔ پہلے وہ ایک مظلوم بیوہ کی حمایت میں ایک بڑے ظالم سے ٹکرایا یہاں تک کہ اسے ہمیشہ کیلئے ختم کردیا اور پھر وہ قومی عزت وناموس کیلئے آخر دم تک لڑتا رہا۔ اسے کوئی نہ ہرا سکا۔ بالآخر وہ اپنے مقصد کی تکمیل میں جاوداں ہوگیا۔

نمونہ کلام:

کوہ انت بلوچانی کلات
آس باں اڑ بازگیراں گہ انت
بُرزیں ہشی ہماگیگ انت
امبراہ بے راہیں گرانت
آف بہو کیں چشمہ بنت
کوزی پھیشیں کنڈل انت
نشیں جہ کرکاوگ انت
بوف ڈغاری تحگ انت

بورمے سویدیں چھبو انت
مے بچھ گشنیں کونڈل انت
مے زامات شلیں خنجر انت
مے برات تلاریں اسپرانت
مے عاریف مزن تا پیں لُر انت

ما خونخیفو رپنگوں
زی بیگی ایر کپنگوں
حلق ءِ من دیتہ شاعرے
شعر گوشتن ءَ کیاں گرے
ماجلسے گونڈے گھتہ
شعر شاعرءَ نوکے جتھ
بیورغ شغانے گوں کھتہ
بیورغ! تحئی عقل من سریں
جسنغ بلوچی چھونہ ایں
چتیں منی حون گوریں
شاہی بنگویں برات نکریں
سمین۔ دوداں ، گورتھویں
طوطا، چندرام ہوتیں کاوری
مسکانی مُرید
جنگانی سَر دراہزیں رئیس
تھو گشتہ پدی چندر ءَ نہ گھنت
جنگے نہ داتھم تولغی
شیری ءَ بوریں تھم بدی
نئے بورے گون ایں دہ صدی
نئے لشکرے گراں ویزی

سر ءَ ہر شف چھو بشامی دوڈاں

ں کھایاں پہ مُرغ ءَ

وپچکنت بور ہزاری بستغت

مَنہ ءَ آہیزگ انت

کاری گشے ما منیروان ہمچوش شئے

ز قادریں نیموں روشے اژمنیں

بازیگریں چند نخیفو ءِ لُرو ءَ

قادر ءَ واڑتھ پہ تیغانی رِد ءَ

کے قلعے ہیں!

جھونپڑے، محلوں سے بہتر ہیں؛

یاں ان کے ہمسائے ہیں؛

ستے ان کے راہی ہیں؛

تے ہوئے چشموں کا پانی پیتے ہیں؛

ں) کے پتے اُن کے آبخورے ہیں؛

چوڑی ڈھالیں ہمارے بھائی ہیں'
چوڑے پھل والی تلواریں ہمارے بزرگ ہیں'

O

مَیں اور تخیفو کل شام روانہ ہوئے
بستی میں ہم نے ایک شاعر کو دیکھا
ایسا شاعر جو شعر گوئی میں کیمیا گر تھا'
ہم نے اس کے ساتھ مختصر سی مجلس کی'
شاعر نے اپنا نیا کلام سُنایا'
جس میں بیورغ کی طرف سے طنز کیا گیا ہے۔

O

بیورغ تم ہوش میں ہو؟!
بلوچ اس طرح پیٹھ نہیں دکھایا کرتے'
میرے ساتھ خُون تمہارے ذمّے ہیں'
آہ میرے وُہ ،والعزم بھائی جو کسی عظیم پہاڑ کی طرح
مضبوط تھے'
ہمیّن اور دودا کا خون تمہارے ذمّہ ہے۔
اسی طرح چندرام اور جیالے کاوری کا خُون بھی
اور طوطا اور مسکان کے بیٹے مُرید اور جنگجو رئیس'
انہیں تُو نے مارا اور اس کا انجام نہ سوچا۔

O

میں کبھی گیدڑ کی سی لڑائی نہیں لڑا بلکہ میں
نے ہر مرتبہ دشمن کو شیر کی طرح پچھاڑا ہے۔
میرے پاس کوئی ہزاری گھوڑا نہیں ہے۔
اور نہ ہی میرے ساتھ کوئی کثیر التعداد لشکر ہے
بلکہ میں 'تنہا' ہر رات ساون کے بادلوں کی طرح
گرجتا ہوں۔
اور گھٹاؤں کی طرح میدان جنگ میں آتا ہوں
تمہارے نوجوان محلّوں میں رہتے ہیں اور ان کے
ساتھ اعلیٰ قسم کے ہزاری گھوڑے ہیں۔
اور وہ سایہ دار چھپروں کے نیچے بندھے ہوئے ہیں۔

O

بیورغ! تم خود کو بے قصور بتاتے ہوئے کم فہمی کی
باتیں کرتے ہو۔
اور لوگوں سے یوں کہتے ہو۔
کہ دودا کی موت خدا کی طرف سے مقرر تھی۔
مجھے ناحق اس کی موت کا بہانہ یعنی اس کا قاتل بنایا
گیا ہے!
بیورغ! جس طرح کہ تم مکار ہو' ایسے کئی مکار نخیفو کی
تیز تلوار کے ذریعے اللہ تعالیٰ کے حکم سے مارے
گئے۔
وہ ہماری تلوار کی تیز دھار کی نذر ہو گئے!!

O

مہناز

بلوچی زبان کی ایک شاعرہ

بلوچی ادب میں مہناز ہی ایک ایسی شاعرہ ہے جس کا کلام مقبول ہوا اور اس مقبولیت کی وجہ اس کی اپنی داستان محبت بھی ہے' شاید اسی محبت ہی نے اسے شاعرہ بنادیا۔ یوں تو سیمک بھی شاعرہ تھی' لیکن اس کی شاعری صرف محبت کی نوحہ گری ہے' وہ اپنی ناکام محبت کی نوحہ گر ہے' اس کے علاوہ مشہور بلوچی رومان ''حانی شہہ مُرید'' کی ہیروئن حانی کے متعلق بھی کہا جاتا ہے کہ شہہ مُرید کی محبت نے اسے شاعرہ بنادیا تھا' کچھ اشعار بھی اس سے منسوب کئے جاتے ہیں' لیکن صحیح طور پر اس کی تصدیق نہیں ہوسکی کہ فی الواقعی وہ شاعرہ تھی البتہ مہناز کے متعلق وثوق سے کہا جاسکتا ہے کہ وہ شاعرہ تھی لیکن چونکہ وہ اپنے دور میں اُبھر نہ سکی اس لئے چند ایک مشہور رومانی اشعار کے علاوہ اس کا کلام ناپید ہے' اور اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ وہ ایک ایسے معاشرے سے تعلق رکھتی تھی جس میں عورت کو کوئی اہمیت نہیں دی جاتی' جہاں عورت کیلئے شاعری ممنوع ہی نہیں گناہ بھی ہے۔ اس لئے مہناز اپنے دور میں گمنام رہی' اور اس کا کلام بھی گمنامی کی حالت میں رہا۔

نوٹ۔ بعض کے نزدیک مہناز شاعرہ نہیں ایک رومانی کردار ہے، لیکن درحقیقت وہ شاعرہ تھی۔ (مصنف)

مہناز کی داستان محبت اور اس کے جو اشعار ہم تک پہنچے ہیں ان کے مطالعہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ مہناز' شاہداد ہوت کی خالہ زاد بہن تھی وہ بچپن میں اکٹھے کھیلا کرتے تھے' لیکن بعد میں انہیں کچھ عرصے کے لئے علیحدہ ہونا پڑا۔ شاہداد' مہناز سے بہت دور چلا گیا وہاں اس کے والدین کی مرضی کے مطابق اس کی شادی مرگو نامی ایک عورت سے ہوگئی' مگر یہ بندھن قطعی بے جوڑ ثابت ہوا' مرگو ایک عام شکل وصورت کی عورت تھی' اور شاہداد حسین وجمیل جوان تھا چونکہ اس کے دل میں مرگو کے لئے کوئی کشش نہیں تھی اس لئے وہ اکثر گھر سے باہر رہنے لگا۔ اب اسے مہناز کی یاد ستانے لگی' مہناز اس وقت بھی جب وہ اکٹھے کھیلا کرتے تھے' قصبہ کی عام لڑکیوں سے زیادہ حسین تھی۔ اس کے دل میں مہناز کو دیکھنے کی آرزو پیدا ہوگئی۔ چنانچہ جب وہ اپنی خالہ کے گھر پہنچا تو اس نے مہناز کو پہلے سے کہیں زیادہ حسین وخوبصورت پایا۔ وہ کچھ دن وہاں رہا' آخر ایک دن اس نے خالہ سے اپنا مدعا کہا اور مہناز سے شادی کی آرزو کا ذکر کچھ اس پیرائے میں بیان کیا کہ خالہ نے اس کی درخواست قبول کی اور وہ چند روز بعد مہناز کو بیاہ کر کے اپنے گھر لے آیا۔

مہناز حسین تھی' جوان تھی' سب سے بڑھ کر یہ کہ وہ شاہداد کی چہیتی تھی اس لئے گھر میں مہناز کی موجودگی مرگو کو ایک آنکھ نہ بھاتی تھی' وہ اس سے جلتی تھی' وہ مہناز کو اور ستانے کے لئے موقع کی تلاش میں تھی ایک دن جب شاہداد شکار سے واپس آیا مرگو نے ایک جھوٹا واقعہ بیان کر کے مہناز پر یہ تہمت لگائی کہ عمر خان نوہانی کے ساتھ اس کے ناجائز تعلقات ہیں' یہ واقعہ کچھ اس طرح بیان کیا جاتا ہے کہ ایک روز جب شاہداد شکار کے لئے گھر سے باہر تھا اور رات گئے تک واپس نہ آیا تو مرگو کو سازش کا موقعہ مل گیا اٹھی اور اس نے پرانے مردانہ جوتے اٹھائے اور خیمہ سے باہر نکل گئی اور پھر جوتے پہن کر خیمہ میں داخل ہوئی دوبارہ باہر گئی اور پہاڑ سے واپسی جو جوتے بغل میں دبائے اپنے خیمہ میں آگئی اور بستر پر سوگئی' جیسے کچھ ہوا ہی نہیں' لیکن شاہداد دوسرے دن شکار سے

واپس لوٹا تو مرگو نے اسے علیحدہ کر کے بتایا کہ لوگ مہناز کو اچھا نہیں سمجھتے کیونکہ اس کے عمر خان نوہانی کے ساتھ ناجائز تعلقات ہیں چنانچہ وہ رات بھی آیا تھا' یقین نہ آئے جوتوں کے نشان اس کا ثبوت ہیں شاہداد نے مرگو کی بات پر یقین کرلیا اس نے جوتوں کے نشانات کو عمر خان نوہانی کے جوتوں کے نشان سمجھ کر مہناز سے بدظن ہوگیا۔ وہ مرگو کی سازش کے جال میں پھنس گیا، اسے مہناز پر بہت غصہ آیا۔ غیرت کا معاملہ تھا اس نے مہناز کو بری طرح پیٹا اور گھر سے باہر نکال دیا حالانکہ مہناز نے اپنی بے گناہی کے ثبوت میں کافی دلائل دیئے وہ شاہداد کے پاؤں پڑی اور اسے اپنی پاک دامنی کا یقین دلاتی رہی 'مہناز نے اپنی پاکیزگی اور محبت کا اس طرح یقین دلایا:

پہ ہپوکانی بستگیں دروگاں
یا ترا چوریگان بٹال داتیں
لٹوں چو مستیں لیڑہ ءَ داتیں
چابک چو بارگاہ ءِ تلیں بوراں
لٹ پمابے حزمین جفاں جُوان بخت
چابک پہ کم ذاتیں خطائیاں
گیشتر پہ ٹی و مولدی چگاں
نہ کہ پہ مہ نازءِ گلین جان ءَ!
من ہما انجیریں پتن تاکیں
برز بما کوہانی سرءَ رستوں
گیشتر بما گٹ وسرشاں بوتوں
من ہما باگ ءِ برزترین درچکوں

سرمنی ہچ گوات ءَ نہ چنڈینگ

بشام ءِ ہوراں بُنڈ نہ میتگ

غیر چہ شاہداد ءِ نوکلین ریشاں!!

ترجمہ:

تمھیں میری سوکن نے جھوٹی باتیں بتائی ہیں
اور یا کسی غیر نے میرے متعلق تمھیں دھوکا دیا ہو
جس کی وجہ سے تم نے مجھے مست اونٹ کی طرح پیٹا ہے
اور اس طرح بھی کہ جیسے شہسوار گھوڑوں کو چابک مارتے ہیں
یا جس طرح غلام اور غلام زادوں کو پیٹا جاتا ہے
کیا ایسا سلوک نرم و نازک مہناز کے ساتھ ہونا چاہیے تھا؟
مَیں ایک وہ چوڑے پتے والا انجیر کا درخت ہوں
جو پہاڑ کی اونچی چوٹی پر اُبھرآتا ہے،
مَیں اس باغ کا اونچا درخت ہُوں،
جسے کسی ہوا نے نہیں ہلایا،
اور نہ ساون مہینے کی تیز برسات اس تک پہنچ سکی ہے،
ماسوائے شہداد جیسے شکیل جوان کے،
جس نے اُسے چھوا ہے!!

بالآخر وہی ہوا جو مرحو چاہتی تھی، کہتے ہیں کہ شاہداد نے مہناز کو یہ کہہ کر طلاق دے دی کہ:

''جاؤ اور عُمر خان نوہانی سے شادی کرلو''!!

اس واقعہ کے بعد شاہداد کی زندگی اجیرن ہوگئی۔ وہ مہناز کو فراموش کرنا چاہتا تھا مگر وہ اسے بھلانے میں ناکام رہا' اور باقی زندگی اس کی فرقت وجدائی میں گزاردی ادھر مہناز نے شاہداد کے طعنے کی وجہ سے انتقاماً عمر خان نوہانی سے شادی کرلی۔ عمر خان نوہانی اپنے قبیلے نوہانی کا سردار تھا اور رندوں کا حریف' ایک وقت تھا کہ وہ میر چاکر خان کا باجگزار تھا' لیکن جب ایک امیر عورت' گوہر' کے اونٹوں کے جھگڑے پر رندوں اور لاشاریوں کے درمیان تیس سالہ جنگ کا آغاز ہوا' تو عمر خان نوہانی' نے میر چاکر خان رند کے بجائے لاشاری سردار کا ساتھ دیا تھا اور اپنے دو ہزار تند خو نوجوانوں کو ساتھ لے کر میر چاکر خان کے لشکر پر عقاب کی طرح جھپٹا تھا۔ اس جنگ میں میر چاکر خان کی شکست کی ایک بڑی وجہ عمر خان نوہانی کی طرف سے لاشاریوں کی بروقت امداد تھی اور اب شاہداد کی زیادتی کی بناء پر مہناز نے محض انتقام کے طور پر عمر خان نوہانی کو اپنی زندگی کا ساتھی چن لیا تھا۔

کہتے ہیں کہ شاہداد بعد میں اپنے کیے پر سخت نادم ہوا' چنانچہ عمر خان نوہانی سے مہناز کی شادی کے کچھ عرصہ بعد شاہداد نے ایک بار کوشش کی اور مہناز کو پیغام بھیجا جس میں عمر خان نوہانی کا تمسخر اڑایا گیا اس میں کہا گیا تھا:

عمر تو ویرانے میں رہنے والا لگڑ بھگڑ ہے
جسے کسان صبح سویرے کھیتوں میں پاکر
حقارت سے دیکھتے ہیں'
اُس کا پیٹ ان تھیلوں کی طرح ہے
جس میں سامان بھر کر گھوڑوں پر رکھا جاتا ہے'
اس کا سر سندھی دیگچے کے مانند ہے

جس میں ایک سالم بڑا دنبہ
بڑی آسانی سے سما سکتا ہے'
وہ صبح سویرے بھیڑوں کے گلے کو
باہر لے جاتا ہے اور شام کو بے ڈھنگی
چال چلتا ہوا واپس آتا ہے اور جھک
کر تیرے خیمے میں داخل ہوتا ہے'
رات کو ایک منحوس جانور کی طرح اس
کی انگلیاں تیری زلفوں کو کھنگالتی
ہیں اور جب کوئی بھیڑ کا بچہ مارے
بھوک کے بھاگ نکلتا ہے تو اس
کے ہاتھ ایک دم تیرے سر کے نیچے
سے نکلتے ہیں اور تیرا سر لڑھک
کر پتھروں پر گر جاتا ہے اور تازہ
خون تیرے گیسوؤں سے ٹپکنے لگتا ہے'

اس پیغام کا مہناز پر یہ اثر ہوا کہ اس نے جواب میں کسی طرح "تسلی" اور "امید دلانے کے بجائے سخت الفاظ میں کہلا بھیجا:

شاہداد! افسوس کا مقام ہے کہ تم مردانگی کے درجے سے
اس حد تک گر چکے ہو کہ ایک شریف عورت کو طعنوں کا
نشانہ بنا رہے ہو ایک بلوچ کو ایسی حرکت کرتے ہوئے
شرم آنی چاہئے'
میں تمہارے گھر میں چٹائیاں بُنتی تھی اب میرے گھر کی

میخیں پختہ ہیں' مَیں اب ہر قسم کے کپڑے پہنتی ہوں!
میرا گھر پیارے بچوں کی میٹھی اور سریلی آوازوں سے
گونجتا ہے' مجھے ہر طرف خوبصورت بچیوں کے
گھنگھریالے بال نظر آتے ہیں'
اگر تجھے دولت چاہئے تو وہ رندوں کے پاس بہت ہے'
اگر تجھے بچوں سے پیار ہے تو مَیں تجھے اپنی ایک ننھی
بیٹی دے سکتی ہوں وہ ننھی بچی جس کے بال بے حد چمکیلے
اور خوبصورت ہیں' لیکن ایسا کرنے سے پہلے عمر کی
اجازت ضروری ہے!!

اس ساری داستان سے معلوم ہوا کہ مہناز کا کردار ایک معصوم اور پاکباز بلوچ خاتون کا پُروقار کردار ہے اور اسی شرافت اور پاکبازی نے اسے شاعرہ بنادیا' اس کی شاعری فطرت انسانی کی صحیح عکاسی کرتی ہے۔

بلوچوں کی تاریخ میں شاہداد نام کی ایک سے زیادہ شخصیتیں ہیں' جو رومانی داستان شاہداد اور مہناز کے نام سے مشہور ہے اس میں بعض کے نزدیک شہداد وہی میر چاکر خان رند کا بیٹا تھا' جو تاریخ میں شاہداد کے نام سے موجود ہے حالانکہ یہ سراسر غلط ہے' مہناز کا شوہر شاہداد' دراصل ایک ہوت بلوچ نوجوان تھا جو اس وقت "باڑہ" باہو کلات (موجودہ ایرانی مقبوضہ بلوچستان) میں رہتا تھا' یہ سرزمین زمانہ قدیم سے اب تک ہوت بلوچوں کا مسکن ہے چنانچہ اس کا ثبوت شہداد و مہناز کی جدائی کے بعد مہناز کے اس پہلے شعر میں ملتا ہے وہ خلوص دل سے کہتی ہے!

کجے چداروت وبارت منی دروتاں
مسک وکافورگوں باڑہی ہوتاں

کون ہے وہ شخص !(کیا کوئی ایسا ہے؟)
جو مُشک کافور کے ساتھ میرا سلام باڑہ کے
ہوتوں کو پہنچادے!

اوراس آخری شعر سے اس کی محبت کے خلوص کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے'

شاہداد منی تروءِ بچ مڑایانی
داں زندگ ءِ منی اوتاک ءِ حیالانی
شاہداد! میرے خالہ زاد!!
زندگی بھرتم میرے خیالات پر چھائے
رہوگے' میں ساری زندگی تمہیں یاد
رکھونگی!!

O

مہناز کے کلام سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ عوامی شاعرہ تھی۔ اس کے کلام میں تشبیہات کا فراوانی ہے جو شاعری میں کردار نگاری کی جان سمجھی جاتی ہے۔ مہناز گمنامی میں رہی اس کی شاعری کا سرمایہ چند مختصر نظمیں اور کچھ اشعار ہیں' اور وہ بھی قریب قریب آج ناپید ہیں' اور اگر کبھی کوئی چیز منظر عام پر آجاتی ہے تو اس کی یاد تازہ ہوجاتی ہے۔ افسوس ہوتا ہے کہ اتنی اچھی شاعرہ شہریت دوام حاصل نہ کرسکی لیکن اس مختصر زندگی اور مختصر کلام کے باوجود وہ بقائے دوام کے اعزاز سے محروم نہ رہی اور اگر وہ شاعرہ نہ ہوتی تو بھی اس کے پاکیزہ رومان نے اسے زندہ جاوید کردیا ہے۔

O

غلام محمد بالاؔچانی

بلوچوں کا ایک افسانہ نگار

وچی زبان کے ادباء وشعراء میں سے جامؔ درک جہاں بلوچی ادب کا
ہے وہاں غلام محمد بالاچانی اس ادب کا فردوسی تسلیم کیا گیا ہے۔ اس نے
دور کے تاریخی واقعات کو رزمیہ شاعری کے ذریعے افسانوی رنگ میں
حاظ سے غلام محمد بالاچانی بلوچی زبان کا پہلا افسانہ نگار ہے۔
ں صدی کے آخری دور میں متاخرین میں سے ایک نیا شاعر غلام محمد
سے بلوچی ادب کے افق پر جلوہ فگن ہوا۔ ابتداء ہی سے اس نے اپنے
کیا اس کی ادبی زندگی کا تعلق چونکہ تصوف سے زیادہ تھا۔ اس لئے اس
وام کے دلوں کو مستخر کرلیا۔ اس نے اپنے معاشرہ کے ماضی کے واقعات
دے کر پیش کیا اور اس زمانے میں ایسا تصوف آمیز رنگ عوام میں پسند کیا جاتا
نی نے شاعری کی چاشنی کے ذریعے اس رنگ کو اور چمکایا اس نے بلوچوں کی
صاحت وبلاغت اور شعلہ بیانی سے ایک باعظمت اور پُرشوکت مستقبل کا پیش
اور اس کے اس فنی کمال نے جہاں اسے عوام میں مقبول بنایا وہاں بقائے
عطا کیا اور آج بھی وہ بلوچی ادب کے عظیم فنکاروں میں شمار ہوتا ہے۔

بلوچی ادب کے ان شاہکاروں کو مشہور بلوچ ادب نواز اہل قلم مسٹر لانگ ورتھ ڈیمز نے 1891ء میں پنجاب ٹیکسٹ بک کمیٹی کی معرفت بلوچی سے انگریزی میں ترجمہ کرکے شائع کرایا۔ اس کے بعد مسٹر ٹمپل نے بلوچی کہانیوں کی صورت میں اپنی تالیف "لیجنڈز آف پنجاب" میں درج کیا۔ تیسری بار 1907ء میں "لندن ولج لٹریچر سوسائٹی" نے ان بلوچوی شاہکاروں کو انگریزی ترجمہ کے ساتھ نہایت آب وتاب سے شائع کرایا اور اس طرح غلام محمد بالاچانی کے ان شاہکاروں سے افسانوی دنیا متعارف ہوئی۔

"ساون کا بادل"

یہ منظوم افسانہ حقیقت میں "میر نود بندغ" کی سیرت پر روشنی ڈالتا ہے جو بلوچوں کے امیر کبیر سردار میر چاکر خان رند کے مخالف قبیلہ لاشاری کا ایک متقی اور متوکل علی اللہ درویش صفت سخی تھا' بلوچی زبان میں "نود" ساون کے بادل کو کہتے ہیں' اور "بندغ" کے معنی آدمی..... غلام محمد بالاچانی نے اس باکمال بزرگ کی سیرت کے دو اہم واقعے اس افسانے میں پیش کئے ہیں جس میں اس نے میر نود بندغ کی فیاضی اور دانائی کو اجاگر کیا ہے میر نود بندغ صرف سخی ہی نہیں تھا بلکہ وہ بلوچوں کے مشہور قبیلہ لاشار کا تمندار بھی تھا' اس کے ادنیٰ اشارے پر قبیلہ لاشار کے افراد کٹ مرنے کو تیار تھے' کیونکہ وہ قرآن حکیم کے فرمودہ کے مطابق اپنے امیر کی اطاعت فرض سمجھتے تھے اور میر موصوف بھی ان پر جان چھڑکتا تھا لیکن اس جاہ وجلال کے باوجود وہ اپنی بے پایاں فیاضی کی وجہ سے اکثر مفلس رہتا تھا اور اس کے اس افلاس کی وجہ سے بعض بلوچ سردار اسے "زاہد خشک" کہہ کر اس کا مذاق بھی اڑاتے تھے۔ مگر ساون کے اس برسے بادل نے وہ رنگ جمایا کہ بالآخر سب نے اس کی بڑائی اور عظمت کو تسلیم کرلیا اور اس کے کارناموں نے بلوچوں میں خودشناسی اور انسانی احساسات کو بیدار کیا' ایک ایسے ہی کارنامے کو غلام محمد بالاچانی ساون کا بادل میں اس طرح پیش کرتا ہے۔

"میر نود بندغ" کی بے پایاں فیاضی کا امتحان لینے کے لئے ایک مرتبہ رندوں

کے سردار میر چاکر خان اپنے سرداروں کے مشورہ سے ایک ''ڈوم'' کو سمجھا کر ان کی جھونپڑی کی طرف روانہ کیا ڈوم نے میر توُد بندغ کے دردولت پر پہنچ کر صدا لگائی اور صاحب خانہ نے گھر کا تمام اثاثہ اٹھا کر راہ خدا میں سائل کو دے دیا' سائل نے گھر کے سامان کے علاوہ کپڑوں کا بھی مطالبہ کیا' میر توُد بندغ کے ہاں سوائے اپنے اور بیوی کے تن کے کپڑوں کے اور کچھ نہ تھا' لہٰذا فیاض امیر نے اپنی پرانی پشتی (چادر) کے دو ٹکڑے کئے اور ان ٹکڑوں سے مرد عورت نے اپنے تن کو ڈھانپا اور بدن کے تمام کپڑے بھی اتار کر سائل کو دے دیئے۔

آدھی رات کا وقت تھا کہ ایک مال سے لدا ہوا غیبی اونٹ جھونپڑے کے دروازے پر آ کر بیٹھ گیا۔ میر توُد بندغ نے اپنی نیک سیرت بیوی کو باہر بھیجا کہ وہ اونٹ کا منہ سونگھ کر دیکھے اگر منہ سے مشک کی خوشبو آئے تو مال اپنائے' اور خدا تعالیٰ کی طرف سے غیبی امداد ہے' چنانچہ اونٹ کے منہ سے مشک کی خوشبو آنے پر مال اتار کر رکھ لیا گیا' اس مال میں کم خواب اور زربفت کے تیار شدہ دو تین جوڑے بھی موجود تھے۔

دوسرے دن علی الصبح میر چاکر خاں نے میر توُد بندغ کو اپنے ہاں ضیافت پر بلوایا تاکہ سب دیکھیں کہ سب کچھ لٹانے کے بعد کس حالت میں ضیافت میں آتا ہے' مگر میر چاکر اور اس کے سرداروں کی حیرت کی انتہا نہ رہی کہ انہوں نے میر توُد بندغ کو مخمل اور زربفت کے لباس میں ملبوس پایا۔

زرزوال

یہ افسانہ بھی توُد بندغ کی عدیم المثال فیاضی کو پیش کرتا ہے اس میں عظیم المرتبت شاعر اور افسانہ نگار نے ایک معمولی سے واقعہ کو نظم کر کے میر توُد بندغ کی فیاضی کو زندہ جاوید کر دیا' اس واقعہ کا ذکر وہ اس طرح کرتا ہے:

''ایک مرتبہ جب میر توُد بندغ کی جھونپڑی پر مفلسی اپنا منحوس سایہ ڈالے

ہوئے تھی اور اس کے زندگی کے دن فاقہ مستی میں گزر رہے تھے امیر کبیر میر چاکر خان نے ایک دن اسے اپنے ہاں ضیافت پر بلایا اور بہت خاطر مدارت کے بعد اسے عزت و احترام سے رخصت کیا ساتھ ہی دو خورجین بڑے تھیلے اشرفیوں سے بھر کر اس کی گھوڑی پر لاد دیئے توُد بندغ کو جب اس کا پتہ چلا تو اس نے اپنی ''پھول گھوڑی'' پر سوار ہونے کے بعد کچھ دور جا کر دونوں خورجینوں میں (نیچے سے) خنجر سے سوراخ کر دیا لہٰذا اس کی جھونپڑی تک پہنچتے ہی دونوں خرجینیں خالی ہو گئیں۔

دوسرے روز جب اس راستے سے رند و لاشار کی خواتین لکڑیاں چننے کے لئے گزریں تو گری ہوئی اشرفیوں سے ہر ایک نے اپنا دامن بھر لیا اور فیاض امیر کو ''زرزوال'' کا خطاب دیا یعنی دولت لٹانے والا' اس واقعہ نے اسے شہرت دوام بخش دی۔

نیکی کی دھار

اس افسانہ نگار نے میر توُد بندغ کی سیرت کو فیاضی کے دامن میں لپیٹ کر پیش کیا یہاں ہمیں میر توُد بندغ مکمل انسان نظر آتا ہے' بہت کم ایسا سننے میں آیا ہے کہ ہاتھ میں آئے ہوئے دشمن کو کسی نے فراخ دلی سے معاف کر دیا بچی اور فیاض توُد بندغ نے میر چاکر خان کو رند و لاشار کی مشہور تیس سالہ جنگ میں معاف کر دیا حالانکہ اس جنگ میں میر چاکر خان اس کا حریف تھا' غلام محمد بالاچانی اس تاریخی واقعہ کو اپنے مخصوص افسانوی رنگ میں اس طرح بیان کرتا ہے۔

''گواہرام'' نے بلوچوں کے درمیان منافرت پیدا کی اور اس کے نتیجہ میں وہ لوگ غیروں کے بجائے اپنوں سے تیس سال تک لڑتے رہے' اس میں رند و لاشار کے بڑے بڑے بہادر کام آئے اور درحقیقت جیت کسی کی بھی نہ ہوئی لاشار قبیلے کا شہرہ آفاق سردار میر توُد بندغ بھی اس منحوس جنگ میں مارا گیا' حالانکہ اس نے جنگ میں رندوں کے عظیم سردار میر چاکر خان کو یہ کہہ کر معاف کر دیا تھا'' کہ نیکی کی دھار تلوار سے

بھی تیز ہوتی ہے'' لیکن حیف کہ چاکر خان کے سرداروں نے اس واقعے سے مطلع ہونے کے
باوجود اسے معاف نہیں کیا' وہ واقعہ یوں تھا کہ اسی جنگ کے دوران میں رودناڑی کے
حصے میں میر چاکر خان لاشاریوں سے لڑتا ہوا زخمی ہو کر بے ہوشی کی حالت میں اپنے گھوڑے
سے گر پڑا اپنے گھوڑے سے گر پڑا' قریب تھا کہ لاشار قبیلہ کے جانباز اس کا کام تمام کرتے
کہ اچانک میر نودبندغ نے وہاں پہنچ کر جلدی سے اسے اٹھایا اپنی ''پھول گھوڑی'' پر سوار
کر کے میدانِ جنگ سے باہر لے آیا اور ہوش آنے پر اسے بیش بہا تحفوں کے ساتھ رخصت
کیا' میر چاکر خان نے فیاض دل میر نودبندغ سے جب اس فیاضی کا سبب پوچھا تو اس نے
مسکراتے ہوئے کہا اے رندوں کے عظیم سردار'' نیکی کی دھار تلوار سے بھی زیادہ تیز ہوتی
ہے''

محبت خان و سومری

یہ تاریخی رومان ہے جو شہبازِ کوہستان، خان عبداللہ خان کے فرزند میر محبت خان سے منسوب کیا جاتا ہے۔ غلام محمد بالاچانی نے اس تاریخی واقعہ کو تصوف کے رنگ میں پیش کیا ہے جس سے یہ رومان بلوچ عوام میں نہ صرف مشہور ہوا بلکہ بے حد مقبول بھی ہوا' افسانہ نگار نے ایک تاریخی واقعے کو افسانوی رنگ میں پیش کر کے جو مقبولیت بخشی ہے یہ دراصل اس کا ادبی کارنامہ ہے وہ اس رومانی افسانے کو اس طرح پیش کرتا ہے۔

''میر عبداللہ خان شہباز کوہستان نے جب ڈیرہ غازی خان کا علاقہ فتح کیا تو اس مرغزار علاقے کے انتظام کو درست کرنے کیلئے ایک سال تک یہاں ڈیرے ڈال کر پڑا رہا' اس موقع پر شہزادہ محبت خان بھی اس کے ساتھ تھا' ایک روز ڈیرہ غازی خان کے بازار میں گھومتے ہوئے شہزادے کی نظر ایک موچیانی عورت پر پڑی' اور اس نظارے کے عوض وہ دل دے بیٹھا پھر اسے حاصل کرنے کے لئے بہت جتن کئے' جب وہ کسی صورت ہاتھ نہ آئی تو اسے زبردستی اٹھا کر اپنے پاس رکھا' سومری موچانی کا خاوند ایک نادار اور مفلس

موچی تھا وہ کیا کرسکتا تھا' رو پیٹ کر خاموش ہو بیٹھا کچھ دنوں بعد جب بلوچی لشکر قلات واپس ہوا تو شہزادہ بھی سومرؔی موچیانی کو ساتھ لیکر روانہ ہوا اور شاہی محل میں بطور کنیز اسے داخل کر دیا ساتھ ہی کام بھی دے دیا کہ سومرؔی ہی اس کے لئے کھانا تیار کر کے پیش کیا کرے۔

ایک طویل مدت کے انتظار کے بعد سومرؔی کا موچی خاوند میر عبداللہ خان کے دربار میں حاضر ہوا اور تمام ماجرا خان اعظم کے گوش گزار کیا اور اپنی حق رسی چاہی شہباز کے لئے انصاف کرنا لازمی ہوگیا اس لئے اس نے اپنے فرزند میر محبت خان کوہستان سے باز پرس کی شہزادے نے جواب میں یہ عذر پیش کیا کہ سومرؔی باندی (خادمہ) کی حیثیت سے مال غنیمت کے طور پر اس کے حصے میں آئی ہے اور اس نے اس طرح اپنے گناہ کو چھپالیا۔ میر عبداللہ خان نے جب اس معاملہ میں سومری سے دریافت کیا تو اس نے صاف الفاظ میں بتایا کہ شہزادے نے واقعی مجھ سے زیادتی کی ہے مگر میرے جانے کے بعد وہ اپنا دماغی توازن کھو بیٹھے گا کیونکہ اسے مجھ سے بے حد محبت ہے، وہ مجھ پر فریفتہ ہے، وہ مجھے کسی صورت میں اپنے سے جدا کرنے پر تیار نہ ہوگا۔

میر عبداللہ خان سومرؔی کے اس بیان پر تذبذب میں پڑگیا کہ اس مقدمے کا کس طرح فیصلہ کیا جائے چنانچہ اس نے موچی کو اس بات پر رضا مند کرنا چاہا کہ وہ اس کی سلطنت میں جس لڑکی کو پسند کرے اس کے ساتھ اس کی شادی کردی جائیگی' مگر موچی نے اپنی بیوی کے سوا کسی دوسری عورت سے شادی کرنے سے انکار کرتے ہوئے اپنی بیوی کا مطالبہ کیا' اور حصول مقصد میں ناکامی کے بعد میر عبداللہ خان کے دربار سے مایوس ہوکر سیوستان کو روانہ ہوا' اور وہاں حضرت شیخ عثمان مروندیؒ (شہباز قلندر) کے مزار پر جاکر حاضر ہوا' اور پھر تین برس تک وہاں فقیروں کی سی حالت میں درگاہ شریف کے منگے بھرتا رہا اور زائرین کی خدمت کو اپنا مقصد بنا کر وہیں رہنے لگا۔

ایک رات جب وہ سو رہا تھا اسے خواب میں حضرت عثمان مروندیؒ نے اپنی

زیارت کا شرف بخشا اور اسے واپس اپنے وطن جانے کو کہا اور ساتھ ہی اسے یہ خو
بھی دی کہ وہاں ایک ولی اللہ ہے جو گدھے چرانے کا کام کرتا ہے' وہ اس کی بیوی
دلا دے گا۔ دوسرے دن موچی خوشی خوشی اپنے وطن کو روانہ ہوا اور وہاں پہنچ کر اس
ولی اللہ کی تلاش شروع کر دی آخر بہت کوشش کے بعد وہ ولی اللہ اسے مل گیا۔ اس
موچی کو بلا کر کہا کہ ''حضرت شیخ عثمان مروندیؒ بھی عجیب بزرگ ہیں جو کام ان سے
ہو سکتا دوسروں کے سپرد کر دیتے ہیں' بہر کیف میں تمہارا کام کر دونگا کل شہر کے غربی
میں ایک امیر شخص کی شادی ہے، وہاں رقص بھی ہوگا تم وہاں موجود رہنا تمہیں وہیں
مقصود حاصل ہوگا' چنانچہ اگلے روز موچی وہاں پہنچ گیا' رقص شروع تھا رقاصہ ناچ رہی
ولی اللہ محفل سے ذرا دور بیٹھا تھا' موچی بھی اس کے پاس جا کر بیٹھ گیا تھوڑی دیر بعد
اللہ جب وجد میں آیا تو اس نے چلا کر کہا' وہ آئی' دیکھنا وہ آئی' اور دوسرے لمحے اس
فضا میں ہاتھ پھیلا کر سومریؔ کو (جیسے کہیں سے کھینچ لایا ہے) پکڑ کر موچی کے حوالے
اور خود وہاں سے جلدی اٹھ کر چل دیا۔ جب اس کے خاوند نے پوچھا کہ وہ اس وقت کہا
تھی تو سومریؔ نے بتایا کہ وہ شاہی محل میں آٹا گوندھ رہی تھی اس نے آٹے سے بھرے
ہوئے ہاتھ بھی اسے دکھائے وہ بے حد متعجب ہوا' اور اپنی بیوی کو خوشی خوشی گھر لے آیا۔

غلام محمد بالاچانیؔ[1] بلوچی ادب میں رزمیہ شاعری کا استاد اور ماہر تسلیم کیا جاتا ہے
اس کا بیشتر کلام رزمیہ واقعات کی عکاسی اور ترجمانی کرتا ہے دوسرے لفظوں میں اس کے
کلام کا زیادہ حصہ رزمیہ شاعری سے متعلقہ واقعات کے افسانوی رنگ میں رنگا ہوا ہے
یوں بھی بلوچی ادب میں رزمیہ داستانوں کا کافی بڑا سرمایہ موجود ہے۔ ان داستانوں
مرکزی واقعہ وہ جنگ تیس سالہ ہے جو بلوچوں کے ''عظیم قبیلوں رند و لاشار کے
درمیان 1489ء سے 1519ء تک جاری رہی۔ غلام محمد بالاچانیؔ نے بھی اپنے مخصوص

رنگ میں اس جنگ کا تذکرہ کیا ہے بلکہ اس نے اس عظیم واقعہ کو اپنی رزمیہ شاعری کے ذریعہ افسانوی رنگ میں پیش کیا ہے نمونتہً اس کا کچھ حصہ یہاں پیش کیا جاتا ہے تاکہ غلام محمد بالاچاچی کی رزمیہ شاعری کا اندازہ بھی ہو سکے وہ اس جنگ کا اختتامیہ یوں بیان کرتا ہے: تیس سالہ جنگ کے بعد رندوں کا سردار میر چاکر خان لاشاریوں کے سردار میر گہرام خان کے جواب میں کہتا ہے۔

گواہرام تم یوں دشمنی کر کے اور بلوچوں کے درمیان غبار کدورت پیدا کر کے اپنا ہی نقصان کر رہے ہو، تم تو ایک بار اپنے کھیل میں کامیاب ہو گئے اور رندوں کی تیز رفتار گھوڑیوں کو جن کے قدموں کے نشان مید کے میدانوں پر ثبت تھے مار ڈالا لیکن یاد رہے کہ اس کا بدلہ کیا ملا؟ باجی اور تودھاک کا بیٹا کس طرح ایک ساتھ مارے گئے؟

آدم اور شہرہ آفاق فیاض تود بندغ احمد اور عامی تاف کالو کے ساتھ کیا ہوا؟ تم جنگ اور خوفناک لڑائی سے جنگلی گدھوں کے غول کی طرح میدان جنگ سے سرابر ہو کر بھاگ نکلے جبکہ رندوں کے تیروں نے پیچھے سے تمہارے کولھوں کو چھلنی کر دیا۔

تم واب کے قلعے سے بھاگ گئے اور تم نے مید کے دہانے پر جا کر دم لیا' یہ سب کچھ ہوا لیکن میں نے کبھی اس پر تمہاری ہنسی نہیں اُڑائی اور نہ کبھی کسی کو یے ہی کو اس خیال سے بھیجا کہ وہ تمہارا مذاق اڑائے اور تمہارے سامنے بیٹھ کر واقعات کو طنبورے پر گا کر سنائے۔

تمہارے کان کے نیچے میرے شیر جیسے پنجے کا تھپڑ نہیں پڑا اور نہ تم ایک خوفزدہ گھوڑی کی طرح اپنا سر مارنے لگتے اور اپنے سر کو دنیا کے کونے کھدروں میں چھپاتے پھرتے، تم میں سے آدھے کچھ اور گجرات کی طرف نکل گئے اور آدھے بہاولپور کی طرف چلے گئے تم اب رندوں کے سامنے سر جھکائے آئے ہو اس لئے تم شرمناک بوجھوں کے نیچے دبے جا رہے ہو!!

ا۔ مزاری قبیلہ سے تعلق رکھتا تھا اور روجھان ان کا وطن تھا۔ (مصنف)

سیمکؔ

بلوچی زبان کی عظیم شاعرہ

سیمکؔ کی شاعری بلوچی ادب میں منفرد حیثیت رکھتی ہے اور اسی انفرادیت نے اسے بلوچی زبان وادب کی عظیم شاعرہ بنادیا' بعض مہنازؔ کو بھی بلند پایہ شاعرہ قرار دیتے ہیں۔ لیکن اس کے ہاں یہ بات نہیں بلکہ بعض تو اسے شاعرہ بھی نہیں مانتے مگر سیمکؔ کی شاعری عوامی خیالات واحساسات کی ترجمان ہے، اس لئے اس کے بعض طویل شعر (بلوچی زبان میں شعر کا لفظ غزل اور نظم کے لئے مستعمل ہے) لوک گیت کی حیثیت اختیار کر چکے ہیں۔

سیمکؔ کی شاعری سوز وگداز سے لبریز ہے۔ یہ عظیم شاعرہ دور اوّل سے تعلق رکھتی ہے' لیکن زبان وخیالات کے لحاظ سے متوسطین سے متعلق ہے' دراصل اس نے اپنے ذاتی جذبات واحساسات کو اپنی شاعری میں کچھ ایسے فطری انداز سے پیش کیا ہے کہ یہ ہر شخص کو اپنے جذبات ومحسوسات معلوم ہوتے ہیں۔ اس کی شاعری میں داخلیت ہے' لیکن اس کے باوجود نئی تشبیہات واستعارات بھی ملتے ہیں۔ اس پر طرہ یہ کہ کوئی تشبیہ یا استعارہ غیر فطری نہیں اور یہی اس کی شاعری کا کمال ہے۔ سیمکؔ کی شخصیت اور شاعری پر کچھ کہنے سے پہلے اس کے حالاتِ زندگی خصوصاً اُس المناک المیہ کا جائزہ لینا ضروری ہے جس نے اسے سوز وگداز بخشا' شاعری عطا کی اور شخصیت کو بنایا سنوارا۔ حالاتِ زندگی کے متعلق کچھ زیادہ معلومات نہیں' کیونکہ تاریخی طور پر پورے حالات زندگی کہیں درج نہیں' یہاں قریب قریب روایات ہی پر انحصار ہے' کہتے ہیں کہ سیمکؔ کی شادی اپنے قبیلہ رند کے ایک خوبصورت نوجوان نتھاؔ نامی سے ہوگئی۔ جسے وہ دل وجان سے چاہنے لگی'

شادی کو کچھ زیادہ عرصہ نہ گزرا تھا کہ اس کا شوہر نتھا ایک قبائلی لڑائی میں شہید ہوگیا۔ سیمک یہ عظیم صدمہ برداشت نہ کرسکی اور پاگل ہوگئی ایک طویل عرصے کے بعد جب وہ کچھ سنبھلی تو نتھا کو یاد کرکے اکثر روتی رہتی۔ اس نے نتھا کی یاد اور جدائی میں بڑے پُرسوز اشعار کہے جو بے حد مقبول ہوئے' سیمک نے اپنی بقیہ زندگی نتھا کے سوگ میں گزار دی' اس سلسلے میں ایک دلچسپ روایت بھی مشہور ہے کہ جب نتھا مارا گیا تو سیمک اس صدمہ سے پاگل ہوگئی سال دو سال کے بعد ایک دن لوگوں نے دیکھا کہ وہ بالکل ٹھیک ہوگئی ہے اور یوں لگتی جیسے نئی نویلی دلہن ہے سیمک کی ماں نے اس سے اس کی وجہ پوچھی آخرکار ماں کے زیادہ اصرار پر اس نے بتایا کہ جب میں پاگل تھی تو ایک رات نتھا کی قبر پر گئی' اور وہاں دیر تک روتی رہی اور پھر اچانک ایسا محسوس ہوا کہ گویا نتھا کی روح قبر سے نمودار ہوئی اس نے دیر تک مجھ سے محبت کی باتیں کیں اور تسلی دی اور پھر اکثر وہ مجھ سے ملتا رہا' اسی خوشی میں میں جوان ہوگئی' لیکن ماں! نتھا نے مجھے کہا تھا کہ یہ راز تم نے اگر کسی کو بتادیا تو میں پھر تم سے نہیں ملوں گا' اب وہ مجھ سے کبھی نہیں ملے گا' ماں! کاش تم نے مجھ سے یہ نہ پوچھا ہوتا اور پھر اس کے بعد وہ رو رو کر پاگل ہوگئی' سیمک کا یہ شعر اس واقعہ کی شہادت دیتا ہے۔

ماں بروتاں برنگلیں ریشاں
چوٹوا دھنزتی زوا دانی

O

جب نتھا قبر سے نمودار ہوا تھا تو اس کی
خوبصورت داڑھی اور مونچھوں پر جنتی کستوری
لگی ہوئی تھی اور وہ اس خوشبو سے معطر تھا۔

سیمک کی شاعری میں سوز و گداز بھی ہے اور فن بھی' وہ نتھا کی محبت میں دیوانی ہے اور یہی دیوانہ پن اسے فن کی بلندیوں پر لے گیا ہے' فن اور محبت کے ملاپ کا ایک شاہکار ملاحظہ ہو وہ نتھا کی یاد میں غرق ہوکر گنگناتی ہے۔

سراکشیت استنی

ڈامڑاں

بُوزیں چوماران ءِ تویں کوہ ءَ

کوکرے نتھائے سراپاخیں

جھرنتی سموئیں گلالک

زنپاں تی موڑتیں جابہئے تیر

شَف گروخ میان ءِ گھوریں تیغ

گرندہ شے نتھائے توپک ءِ تیر

O

دھندوغبار کے بادل چھٹ گیے ہیں نتھا اتنا اونچا دکھائی دیتا

ہے جیسے کوہِ ماران کی بُلند چوٹی'

اس کی پگڑی ایسی سفید ہے جیسے ساون کے گھنے سفید بادل

کے ٹکڑے' اس کے اپنے گھنے بال شانوں پر ایسے بکھرے

ہوئے ہیں جیسے موسلادھار بارش اور مجھے تو ایسے محسوس ہوتا

ہے کہ بارش کے یہ قطرے نتھا کی بندوق کی گولیاں ہیں۔

میرے شوہر کی آبدار تلوار ایسے چمک رہی ہے میان میں' جیسے رات میں بجلی چمکتی ہے۔

اور نتھا کے بندوق کی گولی کی آواز کچھ ایسی ہے جیسے بادل کی گرج!

ان اشعار میں تشبیہات کا اندازہ لگایئے یہ تشبیہات کتنی فطری ہیں' بارش کے قطروں کو بندوق کی گولیاں' چمکتی بجلی کو تلوار' اور بادل کی گرج کو بندوق کی دھندناہٹ سے تشبیہ دینا کس قدر عجیب اور حقیقی ہے' اس میں مقامیت بھی ہے اور اس دور کے بلوچی فطری جذبہ "رزمیہ" کا واضح اظہار بھی ہے اور یہ اس دور اور ماحول کی صحیح عکاسی ہے۔

پیارے اور محبوب شوہر کی شہادت کے بعد سیمک سراپا غم و یاس بن جاتی ہے

...نیا اس کی زندگی کا روگ بن جاتا ہے' اس لئے وہ ساری زندگی اسی وگ میں ...رتی ہے' زندگی میں اگر کبھی بارش ہوتی ہے اور ہلکی سی پُھوار اسے بھگو دیتی ہے تو وہ ...پڑتی ہے اور پھر اس کا یہ گریہ گیت بن جاتا ہے اور وہ سسکیاں لے لے کر کہتی ہے:

گال ءَ بولی بیت گوں تانہی نوڑاں
شما کھئی تُنی ئین دل ءَ کائیت؟
شما کھئی چم ءِ گریتگین ارس ات
شما کھئی منّت ءَ من نیت
چو جواب داتہ تانہی نوڑاں
سیمکؔ ءِ تنی ئیں دِل ءَ کاؤں
سیمکؔ ءِ چم ءِ گریتگیں ارسوں
ماجن ئے ویراں گونگ ءَ دیتہ
تو ئے نتھاءِ گنوخ پیتہ
رنگ چو آسانی پُھراں پیتہ

O

تانہی (ایک گاؤں) کی طرف سے آئی ہوئی
پھوار سے میں نے پوچھا کہ تم مجھے کیوں
بھگو رہی ہو' تم کس کی روتی ہوئی آنکھوں کے
آنسو ہو!
مجھے جواب ملا کہ میں تمہیں سیمکؔ کے صدقے
میں بھگو رہی ہوں' کیونکہ میں سیمکؔ کے

آنکھوں کا گریہ ہوں وہ سیمک جو نتھا کی جدائی

میں دیوانی ہوگئی ہے۔

غم کی آگ نے جس کی حسین صورت کو بجھی

ہوئی راکھ میں بدل دیا ہے!

O

سیمک یہ بخوبی جانتی ہے کہ اس کا محبوب شوہر نتھا اب ایسی جگہ گیا ہے جہ[اں] سے وہ واپس لوٹ کر نہیں آسکتا پھر بھی اس خود فریبی میں مبتلا ہے کہ وہ مہم سے ضرور...

ذرا یہ اظہار خود فریبی دیکھئے:

پ منی چنن نتھا مہم ءَ اَنت

پ من ءَ کاریت چٹ ءَ چنڈیاں

O

نتھا مرا تو نہیں، وہ تو مہم پر گیا ہوا ہے اور

وہ کامیاب واپس آئے گا، اور میرے

لئے خوبصورت جوڑا لائے گا میں اسے

پہن کر پھولی نہ سماؤں گی!

سیمک کہاں پیدا ہوئی اور وہ اب کس خطہ زمین میں دفن ہے، اس کا علم شاید اگلے وقتوں کے بلوچوں کو ہوگا، لیکن ایک ایسی شخصیت کے لئے جس نے اپنے قول و عمل سے لوگوں کے دلوں میں گھر کرلیا ہو، اس کی موت وحیات کے متعلق تفصیلات میں جانے کی کیا ضرورت ہے ایسی ہستیاں اپنے کارناموں کی وجہ سے ہمیشہ زندہ رہتی ہیں اور قید و مکان

وزمان سے بے نیاز...... سیمکؔ اپنی شخصیت، کردار اور فن کے لحاظ سے زندہ جاوید ہے اور
اس کی شاعری اپنے عوام کے دِلوں میں زندہ ہے!

O

نمونہ کلام

کوہ ماڑان ءِ مسافر

سیمکؔ

شہ مجاں استیں ءِ سر ءَ کشیت
برز شہہ ماران ءِ کمیں کوہ ءَ
کوکڑ چو نتھاءِ بیرمیں پاگ انت
شپ گروک، میان گوہریں تیغ انت
دریں شہہ ملت ءِ سیکریں واگ انت

O

تانہی نوداں گوں شما عرض انت
گور صحادانی زیارتاں گوارت
یک دے مونجاتی کنے ترنیان
در کپیت تنگو درو شمین نتھا

O

گال ءَ بولی بیت گوں تانہی نوداں
شماکئی تنی ئیں دِل ءَ کائیت
شماکئی چم ءِ گریتگیں ارس انت
شماکئی منت ءَ من منیت

O

چو جواب داتہ تانکی نوداں
سیمک ءِ شئی کمیں دل ءِ کاوں
سیمک ءِ چم ءِ گریگیں ارسوں
ماجن ءِ ویران گونگ ءِ دیتہ
پہ توءِ نتھا ءِ گنوخ بیتہ

O

پہ منی چن ءِ نتھا مہمان انت
پہ من ءِ کاریت چٹ ءِ چٹیاں

O

(آچ کتاب دَرین)

منظوم ترجمہ:

کوہِ ماران کا مسافر

دھند میں لپٹے ہوئے دُور بلند کوہِ ماران
سے اُبھرے بادل کوہ گر ہے کہ مرے
نتھا کی دستارِ سفید کوندتی برق ہے شمشیر
برہنہ اُس کی اور دھنگ اس کے جوان
اسپ کی مغرور لگام
بادلو برسو بزرگوں کے مزارات پہ برسو
برسو اور پھر تھم جاؤ

کہ حسین نتھا کے درشن ہو جائیں بادلو!
کس کے دِل تشنہ سے پھوٹتے ہو کس
کی احسان گزاری میں برستے ہو
بھگوتے ہو مجھے۔
ہم تو سیمکؔ کے تپتے ہوئے دل سے
پُھوٹے' اور برسے بھی تو سیمکؔ ہی کی
خاطر بَرَسے' ہم تو آنسو ہیں تڑپتی ہوئی
سیمکؔ کی سدا روتی ہوا آنکھوں کے' ہم
نے دیکھی ہے وہ اُجڑی ہوئی خاتون جو
برباد ہے نتھاؔ کے لئے' اور جیسے آتش
ہجراں نے بنا ڈالا ہے اِک راکھ کا ڈھیر'
میرا نتھا' میرا بانکا نتھاؔ' جنگ میں کام نہیں
آسکتا' رزم آرا ہے ابھی زندہ ہے' میں
جو زندہ ہُوں تو موت اس کو نہیں آسکتی'
ہاں اُسے موت نہیں آسکتی! نئے تحفے'
نئے جوڑے لے کر اک دن آئے گا
ضرور آئے گا!!

○

رحم علی مرؔی

بلوچوں کا انقلابی شاعر

دُنیا کی مہذب و بہادر قوموں کی طرح بلوچ، جہاں حریت پسند ہیں، وہاں وہ علم و ادب کے دلدادگان میں سے بھی ہیں۔ اگر وہ اچھے سپاہی ہیں تو شعر و ادب کے اچھے قدردان بھی' اس لئے مری بلوچوں کی قبائلی زندگی میں قومی شاعر کو بلند مقام حاصل ہے' اسے بہادرانہ اور غیرت دلانے والے رزمیہ اشعار کی تخلیق کے عوض' قبیلہ کی طرف سے قومی آمدنی کا ایک معقول حصہ خراج عقیدت کے طور پر پیش کیا جاتا تھا۔ یہ اس زمانے کا ذکر ہے جب بلوچستان میں قبائلی زندگی عروج پر تھی اور ہر قبیلہ اپنی فوقیت اور برتری کے لئے برسر پیکار ہوتا تھا' اس دور میں مری قبیلہ میں بجار خان قومی شاعر تھا۔ اس سے قبل کسی قومی شاعر کا سُراغ نہیں ملتا' لیکن اس کے بعد شاعری گویا صرف اس خاندان کی میراث بن کر رہ گئی' بجارؔ خان کا بیٹا رحم علی شاعر بنا اور اس کے بعد جاڑو جو رحم علی کا بیٹا ہے آج مری قبیلہ کا مقبول شاعر ہے۔

زمانہ قدیم میں بجارؔ خان مری قبیلہ کا قومی شاعر تھا' اور اس کی حیثیت سے اس کا یہ فریضہ تھا کہ وہ مری قبیلے کے بہادروں کی تعریف و توصیف میں اشعار کہے' اور ساتھ ہی اپنی شاعری کے ذریعے قبیلے کے بزدلوں اور غداروں کو بھی منظر عام پر لاکر بدنام کرے تاکہ قوم ایسے لوگوں سے نفرت کرے اور سچے محبِ وطن قوم میں مقبول ہوں۔

بلوچوں کی قبائلی زندگی میں ان کے قومی شاعروں نے اپنے عوام کو ہمیشہ عزت اور آزادی کی زندگی بسر کرنے کا سبق دیا ہے اور اس عظیم مقصد کے لئے انہیں سرفروشانہ طور پر سنسناتی ہوئی گولیوں کی بوچھاڑ میں آگے بڑھنے اور قومی عزت اور ننگ و ناموس

کے لئے جان عزیز تک قربان کرنے کی تلقین کی ہے۔
میدان جنگ میں بلوچ قبائل کا یہ دستور رہا ہے کہ وہ اپنی قومی برتری واقتدار کے لئے ہمیشہ فتح وکامرانی کے طلب گار رہے ہیں، اور اگر خدانخواستہ انہیں کبھی اس میں ناکامی کا سامنا کرنا پڑا تو انہوں نے آخر دم تک لڑتے ہوئے ناکام زندگی پر موت کو ترجیح دی خصوصاً انگریزی سامراج کے دور میں تو یہ ''جذبہ جہاد'' ایک قومی فریضہ کی صورت میں انہیں ہروقت لڑنے مرنے پر آمادہ رکھتا تھا۔ اس زمانے میں مری قبائل کا یہ قومی نعرہ تھا کہ فتح وکامرانی نصیب نہ ہو تو جام شہادت نوش کرو، اس کے علاوہ وہ لوگ اس حقیقت سے بھی آگاہ تھے کہ اگر انہوں نے میدان کارزار میں پست ہمتی کا مظاہرہ کرتے ہوئے بزدلی دکھائی تو قومی شاعر کے طنزیہ اشعار نہ صرف ان کے لئے بلکہ ان کی کئی پشتوں کے لئے زندگی تلخ کردیں گے کیونکہ یہ زہریلے اشعار سینہ بہ سینہ منتقل ہوکر ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ان کی بدنامی وتباہی کا باعث ہوں گے اور بجار خان قومی شاعر کی حیثیت سے مری قبیلہ کے افراد کو جہاں بہادری وجوانمردی کا درس دیتا تھا وہاں وہ انہیں غداری اور بزدلی سے بچنے کے لئے اپنے طنزیہ اشعار میں تنبیہہ بھی کرتا ہے۔ غرضیکہ شاہیجہ مری قبیلہ کا یہ اَن پڑھ فطری شاعر بجار خان زندگی بھر آزادی اور قومی بہادری کے گیت گاتا رہا اور موت سے ہمکنار ہوتے وقت اس کو اطمینان تھا کہ وہ اپنی قومی شاعری کی جو ''شمع فروزان'' چھوڑ چلا ہے اُسے اُس کا جانشین اور لائق فرزند رحم علی بجھنے نہیں دے گا۔
رحم علی اپنے باپ کی زندگی میں ہی ایک شاعر کی حیثیت سے کچھ نام پیدا کرچکا تھا۔ اسی بناء پر بجار خان کو یقین ہوچکا تھا کہ اس کا ہونہار فرزند یقیناً اس کا جانشین بنے گا اور وہ قبیلے کے قومی شاعر کی حیثیت سے مری بہادروں کی شجاعت وجوانمردی اور آزادی کے گیت گائے گا مگر اُسے یہ احساس بھی نشتر چبھوتا تھا کہ اس کا فرزند حسین نغمات کی تخلیق سے محروم رہے گا، کیونکہ جب وہ قومی زندگی میں دشمنوں سے برسرپیکار رہے گا تو

حُسن و عشق کے رنگین نغمات جو بلوچی شاعری کی جان ہیں ان کی تخلیق کے لئے نہ اس کے پاس وقت ہوگا اور نہ وہ رنگین ماحول جس میں محبت کے حسین ساز سے مدُھر اور رس بھرے نغمات کی تخلیق ہوتی ہے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا رحم علی نے چند ایک رومانی اشعار کے علاوہ باقاعدہ کوئی کامیاب رومانی تخلیق پیش نہیں کی چہ جائیکہ وہ حسین نغمات کا خالق ہوتا۔

عام لوگوں کی نسبت شاعر اپنے ماحول سے زیادہ متاثر ہوتا ہے، چنانچہ رحم علی بھی اپنے عوام کی غربت اور انگریز سامراج کی رعونت سے بے حد متاثر ہوا اور اس کے ہونٹوں پر رومانی شعروں کی بجائے نفرت سے بھرے ہوئے اشعار اور آزادی کی امنگوں سے لبریز نغمے کھلنے لگے۔ زندگی بھر اس کی یہ آرزو رہی کہ اس کے ہم وطن خوشحال ہوں اور اس کا وطن انگریزوں کی غلامی سے آزاد ہو۔

رحم علی حقیقی معنوں میں انقلابی اور شعلہ نفس شاعر تھا۔ اس لئے وہ اپنے عوام کے دکھوں اور خوشیوں میں برابر کا شریک رہا اور ان کے زبان میں اپنے انقلابی خیالات ونظریات اشعار کے سانچے میں ڈھال کر ان تک پہنچاتا رہا۔ اس کی شاعری کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کے خیالات ونظریات ایک ایسے نظام حیات کے متعلق تھے۔ جس میں غربت افلاس لوٹ کھسوٹ اور اونچ نیچ کا نام ونشان تک نہ ہو مگر جب وہ اپنے معاشرے میں یہ دیکھتا کہ یہاں ایک ایسا طبقہ بھی ہے جو ہاتھ پاؤں ہلائے بغیر دوسروں کی محنت ومشقت پر خوشحالی کی زندگی بسر کر رہا ہے تو اسے شدید دکھ ہوتا اور وہ عالمِ بے خودی میں چلا اٹھتا:

نیم ئیں ماں کھٹانی سرءَ ٹیلیت نیم شفاں
نیم وتی زنبے نہ کندیت، نیم داریت چاکواں
نیم گوں شادی مُراداں، نیم ناریت پہ غماں

O

بعض تو پلنگ پر نیند کے مزے لیتے ہیں
اور بعض آدھی رات تک روٹی کے لئے
سرگرداں رہتے ہیں۔
بعض لوگوں کو تو پیٹ بھر روٹی نصیب
نہیں، اور بعض اپنے عیش اور آسائش کے
لئے نادار لوگوں کو ملازم رکھتے ہیں،
غرضیکہ کچھ تو شادماں وخوشحال ہیں اور کچھ
دُکھوں کی وجہ سے پریشان ونالاں!

O

قبائل میں ان کے دنوں میں رحم علی اپنے عوام کی خستہ حالی اور افلاس وجہالت سے متعلق سبق آموز اشعار تخلیق کرتا ہے مگر انگریزوں سے جنگ کے زمانے میں اسے قومی شاعری کی حیثیت سے رزمیہ اشعار کی تخلیق کا فریضہ ادا کرنا پڑتا ہے چنانچہ اس اہم فریضہ کی ادائیگی کے سلسلے میں وہ مری بہادروں کو اپنے رزمیہ اشعار سے اپنے وطن اور ننگ وناموس کی حفاظت کے لئے، جان تک قربان کردینے کے جذبہ کو ابھارتا ہے اس دور کے حالات کے مطابق رحم علی کی شاعری اپنے عوام کی بدحالی کی عکاس اور انگریزوں کے ہتھکنڈوں کے خلاف ایک صدائے احتجاج تھی۔

جنگِ آزادی کی تاریخ میں مری قبیلہ کا یہ کارنامہ رہا ہے کہ اس نے بے سروسامانی کی حالت میں بھی انگریزوں سے لڑائی کے درمیان ڈٹ کر مقابلہ کیا، اور ہر محاذ پر انہیں جانی ومالی نقصان پہنچایا اگر انگریز اس موقعہ پر سیاسی حکمت عملی سے کام نہ لیتے تو کبھی کامیاب نہ ہوتے..... وہ جنگ میں اس بہادر قبیلے کو ہرگز شکست نہ دے سکتے۔

علاقہ مری میں ہزب اور گنبد کے مقام پر مریوں کی معرکہ آرائی ہوئی' رحم علی نے ان دونوں تاریخی لڑائیوں کا نقشہ اپنی طویل نظموں میں کھینچا ہے' یہاں پہلے وہ نظم پیش کی جاتی ہے جس میں اس نے "ہزب کی جنگ" کا حال اور اس کی وجوہات کا ذکر کیا ہے' ہزب بگٹی شہر سے دور شمال مشرق کی طرف علاقہ مری میں ایک تاریخی جگہ ہے' وہاں 1918ء میں مری قبائل اور انگریزی فوجوں میں شدید جنگ ہوئی۔ مریوں نے اپنے وطن اور ننگ و ناموس کے لیے ہزاروں نوجوانوں کو قربان کیا۔ رحم علی اس کا ذکر یوں کرتا ہے:

پلنگ ۱ و جرمن ءِ جنگ انت
دوئیں حاکم مڑگ ءَ اتنت
رڑتہ ۲ سیاہ دپیں توپاں
لکھاں گار کنگ ءَ اتنت
سری ۳ لوٹیں ٹمنداراں
سیوی ءَ روگ ءَ اتنت
ٹمنداز سینول ۴ ءَ پُچ انت
جرگہ یاں کنگ ءَ اتنت
پلنگی لوگا ۵ اِنت مرداں
بگائی ءَ دیگ ءَ اتنت
تھوئے بہرام مزاری ئیں
تھئی مڑولام ۶ ءَ روگ ءَ اتنت
مری پہ کوہ ءَ سر ءَ کگاں
میڑائی ۷ ءَ دیگ ءَ اتنت
تھوئے خیربخش ۸ نوابانی

تھرا انصاف ڈھک ءِ اَنت
تھور ءِ تنکھویں سردار
تھنی اوٹ ءِ پلک ءِ اَنت
مزانیں پیر ءِ پیغامبر
تنی غور ءِ کنگ ءِ اَنت
ملوکیں برگ [11] ءُ سیدخان [12]
بیان ءِ زرین کنگ ءِ اَنت
دل ءِ ہوس بازش [13] جنگ ءِ
شمے تکی گیبلک [14] ءِ اَنت
چاری [15] تنکھت چپل ءِ
ہشاری ءِ کنگ ءِ اَنت
پلکی آتکت بوژ ءِ !
جہازان بال دیگ ءِ اَنت
مزاراں پلواں بستت
مری بازیں ترنگ ءِ اَنت
نوداں دوتی نے زرتہ
ہزرت ءِ نودھلک [16] ءِ اَنت
ہزرت ءِ تنکھیں مرداں
ھلوری جیرڈھک ءِ اَنت

ترجمہ:۔

انگریز اور جرمن کی جنگ ہے،
دو بڑی قومیں لڑ رہی ہیں،
کالے مُنہ والی توپیں گرجتی ہیں،
اور لاکھوں انسانوں کو ختم کر دیتی ہیں،
ہمارے تمام سرداروں کو بلایا گیا ہے وہ بس
جا رہے ہیں!
اَب تمندار (بڑے سردار) سبی میں اکٹھے ہو گئے
ہیں اور وہ جرگہ کر رہے ہیں،
یہ اس لئے کہ انگریزوں نے رنگروٹ طلب کیے
ہیں،
اور سردار، اس مطالبہ کو تسلیم کرنے میں پس و پیش
کر رہے ہیں!
بہرام خان مزاری! آپ کے آدمی لام
(جنگ) پر جائیں یہ مناسب نہیں!!

O

بہادر اور جنگجو مری، پہاڑوں کی گھاٹیوں
میں اکٹھے ہونے لگے،
آپ کے حکم سے نواب خیر بخش مری!
آپ کو سب آفرین کہہ رہے ہیں،
کمزور و ڈرپوک سردار، آپ کے طفیل (ذریعے)

بچ گئے ورنہ وہ رنگروٹ دینے پر مجبور تھے! تمام
بڑے پیر اور پیغمبر آپ کے حق میں دُعا کر رہے
ہیں'
نازک طبیعت بی برگ وسید حاں لڑائی کے لئے
اپنی گھوڑیوں کو زین کر رہے تھے'
لڑائی کے لئے ان کے دلوں میں شوق تھا اور ان
کے صافے' کچھ سر پر اور کچھ کاندے سے نیچے
زمین پر گھسٹ رہے تھے'
اور اُدھر مریوں کے جاسوس بھی پہاڑ کی چوٹی پر
ہشیاری سے بیٹھے تھے'
اچانک انگریز ''بوڑ'' کے مقام پر پہنچے اور ان
کے ہوائی جہاز بھی ساتھ ساتھ اُڑ رہے تھے'
شیرِدل مریوں نے لڑائی کے دوران ''پلّو'' (قمیص کے دامن کا ایک سرا) کو دوسرے
پلّو سے باندھا تاکہ پسپا نہ ہوں چنانچہ بہت
سے مری اس حالت میں مارے گئے'
ان شہیدوں کے لئے ہمدردی کے طور پر بادل
اُٹھے اور ہڑب پر تیزی سے برسنے لگے
جو ہڑب کی جنگ میں شہید ہوئے خدا کی طرف
سے ان پر رحمت ہوئی اور وہ خدائی انعام سے
نوازے گئے!!

O

ہڑب کی جنگ پر یہ نظم قومی شاعری کا ایک اچھا نمونہ ہے لیکن رحم علی نے گنبد کی خون آشام جنگ کے متعلق جو نظم کہی ہے، وہ نہ صرف مری قبیلہ بلکہ دیگر قبائل میں بھی بہت مقبول ہے۔ اس نظم میں جہاں انگریزوں سے سخت نفرت کا اظہار ہے وہاں ملک کو ان کی غلامی سے آزاد کرانے کا جذبہ بھی پایا جاتا ہے۔ گنبد علاقہ مری میں ایک تاریخی مقام ہے، جہاں 1918ء میں انگریزوں اور مریوں کے درمیان فیصلہ کن جنگ ہوئی۔ اس پر رحم علی نے ایک طویل یادگار نظم کہی ہے یہاں اس کا آخری بند پیش کیا جاتا ہے:

مڑغ گوں کافر ءِ بھی
در زخم ءَ کئے ءِ جگی
بیا اِت شہید ءَ غازیاں
سمار اِت بور تازیاں
نہ کیتو نوکری ڈھب ءَ
دُنیائی الگی انت ہر بہ ءَ
سروں حیرات انت پہ ربّ ءَ

o

نہ دات وتی پیسو ءَ ناری
خُدا روز ءَ وت کاری
در جنگ ءَ کئے نندی
کناں چوکہ جہاں گندی

o

اب وہ وقت آ گیا ہے کہ ہم (انگریزوں سے)
سے فیصلہ کن جنگ لڑیں'
اب کون ہے کہ جو تلوار کی جھنکار پر رقص کرنے
کو تیار نہیں!؟
آ جاؤ اے غازیو! اور شہیدو! جلد آؤ اور اپنی
اچھی گھوڑیوں کو سنوارو' یہ بے عزتی کی نوکری ہم
سے نہیں ہو سکتی!
اس دُنیا کو ایک دن ضرور چھوڑنا پڑے گا آج ہم
نے عزم کیا ہے کہ اپنا سر اپنے مالِک حقیقی کے
لئے قربان کرینگے اور دونوں جہاں میں سرفراز
ہوں گے'
انگریزوں کا مال اور دولت ہمیں نہیں چاہئے'
ہمارے لئے ہمارا معبود (اللہ) کافی ہے' وہ
ہمیں مالا مال کر دے گا'
اس جنگ سے کوئی دُور رہ سکتا ہے!؟
ہم انگریزوں کے ساتھ ایسا کرینگے کہ دنیا ہماری
جرات اور کارناموں کو ہمیشہ ہمیشہ یاد رکھے گی!

o

تاریخ شاہد ہے کہ اس جنگ میں مریوں نے انگریزوں کے ساتھ نہایت ہی جانبازی سے لڑتے ہوئے اپنی جانیں قربان کیں۔ یہاں تک کہ جب انہیں انگریزوں نے بے بس کردیا تو بھی انہوں نے انفرادی طور پر مورچے بنا کر اس قومی جنگ کو جاری رکھا اور ان کی اس ہمت اور جذبہ آزادی نے انگریزوں کو مریوں سے صلح کرنے پر مجبور کردیا۔

رحم علی کو اپنے انقلابی خیالات کی وجہ سے بالآخر جلاوطن ہونا پڑا' واقعہ یوں ہے کہ انگریزوں کے بہی خواہ مری نوجوانوں میں بیداری کے سخت مخالف تھے' چنانچہ انہوں نے مریوں کو باہمی طور پر لڑانے کی سازش کی اور رحم علی کو بھی اس ''اپنی آگ'' میں جلنے کیلئے جھونک دیا گیا۔ اس نے اپنا دامن بچایا اور سازشیوں پر لعن طعن کرتا ہوا وطن سے ہمیشہ کیلئے چلا گیا' جب یہ آگ ٹھنڈی ہوئی اور قبیلہ کے لوگوں کو احساس ہوا کہ انہوں نے باہمی جھگڑے میں اپنے عظیم قومی شاعر کو کھودیا ہے' تو اس کی تلاش میں قبیلہ کے معتبر لوگ روانہ ہوئے اور ایک جگہ اسے پاکر اسے وطن آنے کی درخواست کی' ایک روایت کے مطابق ان کی یہ درخواست رائیگاں نہ گئی' رحم علی نے اُن معتبرین سے قبیلہ کے غریب لوگوں کے حقوق کے تحفظ کی ضمانت مانگی چنانچہ اس کا یہ مطالبہ تسلیم کرلیا گیا اور وہ اپنے وطن کو واپس جانے پر رضامند ہوگیا' لیکن شاید قدرت کو کچھ اور ہی منظور تھا' اسے اپنے عزیز وطن کی سرزمین دیکھنی نصیب نہ ہوئی وہ وطن کی طرف لوٹتے ہوئے راستے میں موسیٰ خیل (علاقہ لورالائی) کے مقام پر فوت ہوا اور وہیں دفن کردیا گیا۔

ooo

توکلی مست

ٹیلے، چٹیل میدان، اور تاحد نظر ویران پہاڑیوں کا
نگ اور جھلے ہوئے مٹیالے ٹیلے کو دیکھ کر یوں محسوس ہوتا ہے کہ فطرت
گیتی کے اس غیر آباد علاقے کو دیکھ کر یوں محسوس ہوتا ہے کہ فطرت
ر ہم سلسلہ، مری گیتی کے اس غیر آباد علاقے کو قطعی طور پر نظر انداز کر دیا ہے، لیکن اس بے آب وگیاہ خطے میں
ں اس خطہ زمین کو قطعی طور پر نظر انداز کر دیا ہے، لیکن اس بے آب وگیاہ خطے میں
ں اس خطہ زمین کو ... صوفی منش شاعر توکلی مست نے جنم لیا اور اس وادی کی
ں بلے بلوچوں کے شہید عشق، صوفی منش شاعر توکلی مست نے جنم لیا اور اس وادی کی
ک حسین وجمیل دوشیزہ "سمو" کے عشق میں دیوانہ وار گاؤں گاؤں اور قریہ قریہ گاتا پھرا،
ں کے یہ نغمے اب بھی وادی میں گونجتے ہیں اور یہ حقیقت ہے کہ آج جب بھی دن بھر
ی مسافرت سے تھک کر خانہ بدوش مری کہیں پڑاؤ ڈالتے ہیں، تو رات کی خاموشی میں
وادی کی گود سے وہی سحر انگیز آواز بلند ہوتی ہے:۔

پھیری ڑا بیوانے منا کھاتکاں
رستر انی اے کھوہ ۶ بُن ۶ کھوڑاں
دَم ڈے ترپان مہر کھتا اوذا
ساونڑی بیگہ بستغین نوذا

پرسوں مَیں بیابان سے آ رہا تھا
راہ میں ''رستزانی'' کی غاروں
اور گھاٹیوں سے بھی گذر ہوا وہاں بار بار
بارش برسی، اور ایسی رحمت ہوئی، جیسے
ساون کے موسم میں عصر کے وقت کے
برسنے والے گھنے بادل،

○

اور حسین ''سمّو'' کا ذکر یوں ہوتا ہے،
کنجریانی چھار شفی لیواں
ماسُلے عہد انانہ بھوریتاں

○

آوارہ عورتوں کی چار رات کی صحبت کے
لئے،
میں اپنی ''سمّو'' سے کئے ہوئے
عہد محبت کو نہیں توڑوں گا!
اور آخر تان اسی پر ٹوٹتی ہے،

پُشت بخُوں دروغاتی دنیائیؑ
بیاگروں او میٹا خدائیؑ

○

ہمیں آخر اس جھوٹی دنیا کو ترک کر دینا
ہوگا،
پس آؤ راہِ حق اختیار کریں!!

O

توکلی مست شیرانی مری قبیلے کا ایک صوفی منش شاعر تھا، وہ کوہلو کے مقام پر پیدا ہوا اور طویل زندگی پانے کے بعد 1885ء میں وہیں فوت ہوا۔ اس کی عشقیہ داستان مشہور ہے وہ بلوچوں میں شاعر کے ساتھ ساتھ سچا عاشق بھی مانا جاتا ہے۔ اس لئے اس کی داستان محبت بلوچوں میں بہت مقبول ہے اور وہ محفلوں میں گا کر بیان کی جاتی ہے اس کی محبوبہ "سمو" اس کے جذبہ عشق کی زندہ و جاوید حقیقت ہے مگر بعد میں وہ عشق مجازی کے بجائے عشق حقیقی کا متلاشی اور طالب نظر آتا ہے۔ اس کے کلام میں جابجا اس کی جھلکیاں ملتی ہیں اور کچھ اس طرح کہ "سمو" کوئی مجازی ہستی نہیں بلکہ "محبوب حقیقی" کا جلوہ یا پرتو ہے، اس لئے اسے صوفی شاعر سمجھا جاتا ہے۔

تصوف کا مقصد اعلیٰ، اصلاح اور تزکیہ نفس ہے۔ توکلی مست بھی ایک صوفی شاعر کی حیثیت سے اپنے کلام میں اس کی تلقین کرتا ہے لیکن اس کا انداز بیان دوسروں سے مختلف ہے اور اس میں انفرادیت بھی پائی جاتی ہے اور یہ اس لئے کہ وہ صرف صوفی نہیں بلکہ شاعر بھی ہے، چنانچہ وہ اس مقصد کی تکمیل کچھ اس طرح کرتا ہے:

یار ہماں یاراں جائدی یاراں
حیدری گفتاراں، خبرداراں
سومری بے سیثیں نہ پائداراں مڑدماں
ریغے کھشاں، کھلاں گوتھتی کیں دلاں

O

دوست انہیں کہا جاتا ہے جو ہمیشہ کیلئے دوست
ہوتے ہیں' اور جو حیدر (حضرت علیؓ) کے فرمودات یعنی علم
وحکمت کی باتوں سے باخبر ہیں'
غیر محرم عورتیں مردوں کے لئے ناپائیدار ہوتی ہیں'
ان کی دوستی اور محبت بے سود ہوتی ہے' جو مردوں کو
ہوس کے' اونچے بلند پہاڑ پر پہنچا کر وہاں پیاسے دل
کے ساتھ چھوڑ دیتی ہیں'

بلوچی زبان کے تمام شاعروں کی طرح توکلی مست کا بھی اپنا کوئی مجموعہ کلام موجود نہیں اس کے اشعار اور غزلیں قصہ گو اور باذوق بلوچوں کو از بر تھیں اور ان سے سینہ بہ سینہ ہم تک پہنچی ہیں' اور آج بھی بلوچ گائیک "نڑ" (بلوچی بانسری) اور سارنگی پر سوز بھری غزلوں کو محفلوں میں گا کر سناتے ہیں۔

بلوچی زبان کے قدیم شعراء کی غزلوں میں نظم کی سی' یکسانیت پائی جاتی ہے' اور اردو کی جدید غزلوں کی طرح ان میں بھی وہی کیفیت اور ربط وتسلسل پایا جاتا ہے توکلی مست کی ایک ایسی غزل یہاں پیش کی جا رہی ہے جو اپنی جگہ ایک اچھی نظم بھی ہے جسے کوئی اچھا سا عنوان دے کر بلوچی کی بہترین نظموں میں شامل کیا جا سکتا ہے:

من کہ پھیری چھرغاں کا تغاں
مُن ہماں عرغونے گھر ءُ گھتاں
رتغاں پھل من منیری باغاں
شاغ' ءُ انجیر حرزتی شمباں
سبزاں گوبموئیں بر ءُ پتاں

اے خیر کھن چیراں
بازراں کھوہی پچاشنو ڈیواں
چھڑتغاں کھفئ و کوہ سری میدان
کوگ ہماں باغ بانگوہ سایہ
مَن گوں وکانے گراں دیشٔ
دوست گوں پرتگاں زمغین پچّاں
جان کھنت درزی دوت کغیں پوشاں
جبمروبلی چھوگنفین رزاں
وابہ کھنت سردانیٔ دریچاں
پیالہ ماز کھورانی نصیبایاں
گند نواں کچوئے براں سندھئے
پکچیں مئے میشاں پھورا گندئے
گوانکھ جثوں میریں دیروے حانا
شید اڑوں پہ رَب پروانا
روں اؤ ''نیاڈال''ءِ دفءِ بانا
ماکہ زشیری کمربست کمت میاپہ بوکے رندا'
پھاز شپاذا پہ اہلنہیں پھاذاں
ماپہ نیم راہا نہ گرداناں
یاخدا مارا گو ''سملا'' میلئے!

o

میں پرسوں سیر کرنے کو آیا'

وہاں ''تخت الشراء'' جیسے مہیب غار تھے اور وہاں
مہکتے ہوئے درختوں پر پھول اُگے ہوئے تھے'

شاغ (ایک میوہ دار درخت) اور انجیر کے درخت
بھی تھے سبز گھنے پتوں اور اچھے پھلوں سے ان کی
شاخیں لدی ہوئی تھیں!

وہاں پہاڑی دُنبے بھی چر رہے تھے چکور اور جنگلی
کبوتر بھی تھے'

میں نے اس باغ کے صبح کے سائے میں اپنی محبوبہ کو
اس کی تمام رعنائیوں کے ساتھ موجود پایا'

وہ اچھے قیمتی زیور اور بہترین لباس میں تھی' اور درزی
کے سلے ہوئے لباس میں تھی'

وہ ایسے چل رہی تھی جیسے بارش کبھی کہاں اور کبھی
کہاں برستی ہے'

اور جیسے صحراؤں میں ہرن کلیلیں کرتے ہیں' مجھے
ندی کے پانی کا پیالہ اب اچھا نہیں لگتا'

میں نے دیرے (کیمپ) کے منتظم کو آواز دے کر کہا'
کہ بحکم خدا' ہم یہاں سے کل روانہ ہو جائیں گے
''نیاڈال'' کے دامن میں جائیں گے'

دائیں ہاتھ کو' مشرق کی طرف!

چنانچہ میں نے شیر کی طرح ہمت کی اور ایک خاندان

کے پیچھے روانہ ہوگیا'
میرے پاؤں ننگے تھے اس لئے چھالے پڑ گئے'
لیکن اس کے باوجود میں آدھے راستے سے واپس
نہیں ہوا'
اے خدا مجھے میری محبوبہ ''سمل'' سے مِلا دے!!

O

پشتو زبان کے مشہور صوفی شاعر رحمان بابا کا بے ریا عبادات کے متعلق ایک شعر ہے:۔

دَ ریا تر نا قبولہ عبادت
دَساقی پہ میومشت اوخواب حولیں یم

اس میں انہوں نے کہا ہے کہ ''ریا کی ناقبول عبادت سے' ساقی کی شراب سے بدمست اور خراب ہونا بہتر ہے۔'' مشہور پشتو شاعر خوشحال خان خٹک نے بھی بے غرض اور بے ریا عبادت کے بارے میں ایک صوفیانہ شعر کہا ہے:۔

زاهدان چہ نمونځ روژه کی جنت غواری
زماخوشحال ' دَمزدوری عبادت نه زده

''زاہد لوگ' نماز اور روزہ جنت کی خواہش کے لئے پڑھتے ہیں اے خوشحال مجھے مزدوری کی یہ عبادت نہیں آتی''۔

توکلی مست کے ہاں بھی ایسے اشعار ملتے ہیں وہ اس سلسلے میں رحمان بابا اور خوشحال خان کا ہم خیال ہے، لیکن وہ اس خیال کو اپنے مخصوص صوفیانہ انداز میں اس طرح پیش کرتا ہے:

بازیں نمائش روشغاں
سازوں جہانی گندغاں
ایدا کسے ' اولیاء نہ بی !!

دنیا کے دکھاوے کے لئے نماز پڑھنا اور روزہ رکھنا' اس طرح تو کوئی اللہ تعالیٰ کا دوست نہیں بن سکتا!!

یہ ایک قطعہ بھی اسی خیال کی ترجمانی کرتا ہے'

مارا اللہ دِ نبی یا تِن
ازبَھد ءَ دوست ورژمنان تِاتِن
تھانگرین گڑدیں سملے بیلی
نیں گنوخ پیریں اسفہان گوستہ
نیں کہ من قیذاں پھرنگی اے غاں!

o

مجھے اللہ اور اس کا نبی ﷺ ہر وقت یاد ہے۔ لیکن میرے دوست اور دشمن میرا گلا (میری پیٹھ پیچھے) کرتے ہیں'
اور کہتے ہیں کہ کہاں ہے **سمّل** کا وہ پاگل اور **مست** محبوب!!
حالانکہ وہ خود جاہل اور پاگل ہیں!!

میں پاگل نہیں کہ اسے اصفہان میں تلاش کروں

اور نہ میں انگریزوں کی قید میں ہوں'

توکلی مست نے اپنے بعض اشعار میں اپنے نظریات اور اقوال پیش کئے ہیں یہاں ایک ایسا ہی قطعہ درج کیا جاتا ہے' جس میں شعر' قول' سخاوت اور عشق کی حقیقت اچھائی پیش کی گئی ہے' وہ ان کے متعلق کہتا ہے:۔

شعر ہماہاں کہ ننگریں بے برگ ءَ جتاں

قول ہماہاں کہ عمر جاہیناں کھشت

راد ہماہاں کہ زرزوال ءَ داشگاں

عشق ہماہاں کہ لیلٰی ءَ مجنوں ءَ کھشاں

گوں منی گفتاراں حدیثاں وہ گوں دیئیاں

o

اشعار وہ ہیں جو سخی و دانا بی برگ نے کہے ہیں'

قول واقرار وہ جو دلبر عمر نے کہے ہیں'

سخاوت وہ ہے جو زرزوال (تودبندغ) نے کی ہے'

عشق وہ ہے جو لیلٰی و مجنون میں تھا'

میرے اقوال سے تو باتوں کو تقویت ملتی ہے لیکن میرے شعر

حقیقت وصداقت کی چاشنی لیئے ہوئے ہیں!!

آخر میں یہاں نمونے کے طور پر توکلی مست کے وہ اشعار پیش کئے جاتے ہیں' جن میں خلوص وصداقت کے ساتھ فنکارانہ صلاحیت بھی ہے۔

پکھغاں باغ' پہ طالہو بخت ئے
بادشاہ معلوم بیٹھغان تخت ئے

O

باغ(دنیا رعقبیٰ کے) ان لوگوں کے لئے' پکے ہوئے میووں سے لدے ہوئے ہیں' جو نیک اور خوش بخت ہیں'
اور وہ مجھے بادشاہ کی طرح تخت پر بیٹھے ہوئے نظر آئے!

O

شکھلیں ساہ کہ ڈوبرا مانے
پُھرّغ ڈیہانی سواڈہ جوانے

O

جب تک جان (اور اس میں یہ میٹھا دم) سینے میں ہے'
ملک ملک کی سیاحت کرنا اچھا ہے!

O

نیں کہ من قیذائیں پھلنکیغاں
نشتغا گئور ''چوٹی'' اے دہ ئے دنگاں
میر جمالیھاں ، پوترویں ہند ئے!

O

اب ہم انگریز کی قید میں ہیں "چوٹی" کے قرب
وجوار میں قیام ہے'
اور میر جمالہاں کی اولاد کے پاس رہتے ہیں!

o

کونج ءِ قطاریں من گوئے قطارءِ رواں
مئے دل ءِ وشی سمّل ءِ وشیں کھند غان

o

کونج کی قطاروں کے ساتھ جو سمّل کے شہر کی طرف
جارہی ہے' میں بھی جاؤں گا وہاں سمّل سے ملونگا میری
خوشی اس کی مسکراہٹ سے وابستہ ہے!!

o

اے پری ءِ آختہ اژ عرشا
باورا بیارے روح کنتھ ترسا
یہ (سمّل) ایک پری ہے جو عرش سے آئی ہے یقین
کرو روح اس کے دیدار کے لئے ہر وقت ترستی ہے!

o

مہر اژ دیددخاں مرّ وثاں
آں دلی بنداں سند اثاں

o

محبت آنکھوں سے دُور نہ ہو
مبادا دل کے تار ٹوٹ جائیں

o

دوست منی وتی شہد شیرانی
دوست منی روشنائی تہارانی
دوست

o

دوست میرا' دودھ اور شہد کا پیالہ ہے
دوست میرا' اندھیروں کے لئے اُجالا ہے

o

علاقہ مری کی تحصیل کوہلو کو یہ فخر حاصل ہے کہ یہاں توکلی مست جیسا عظیم صوفی شاعر پیدا ہوا' وہ اپنے قبائل کے نزدیک ایک ''بزرگ ترین ہستی'' بھی تھا' چونکہ وہ عشق حقیقی کی مستی میں ہمیشہ مست رہتا تھا۔اس لئے اسے توکلی مست کے نام سے پکارا جاتا ہے' کوہلو میں توکلی کا مزار آج بھی عقیدت مندوں کی آماجگاہ بنا ہُوا ہے' اس کے مزار پر مری قبیلہ کی خواتین 'نذرانہ والی لٹیں'' ایک رومان پرور منظر پیش کرتی ہیں' یہ خواتین ''منت'' ماننے کے بعد اپنی درازلٹیں کاٹ کر مست کے مزار پر ''نذر عقیدت'' کے طور پر پیش کرتی ہیں اور ساتھ ہی اس کے اشعار گنگناتی جاتی ہیں۔

شیئر

دل حیالانی بندے چے بازیں پھہ ستلاءَ
پھنڈ گڑداں بندگوں ھے لاڈاغراں
ٹھنگ کھنے سنگ آں بازین اسراں
گار کھنے زہیران اریکھنے لھمیں غماں
بانک گلانی سنگت شفانی ماں تھئی رنداں شہ کیچ مکرانءَ
باور کارءِ پرتھئی پاءَ تھنغان دریں اُلکہان
زغریں ہنوں مستغاں پھتاں رسندھڑی بازیں پھرغاں
من ہماں مڑداں نام منی سلطان کایاں ژامسورتیہڑاں
بنداں ہتھیاریاں سنج کھناں محل ءَ گیشتر پہ تھئی نہماں
نیم شفی پاساں پہ تھئی پارءَ کھایاں داپب سرشماں
نام مناں نیتھیں ماں وراں درشکانی براں
پھلیں ہنجراں ماں پتریکانی سُہر براں
واڑتھا تھئی دوست ءَ سمل تھئی جیڈی اسراں
پریشتغاں پھیغام زڑتھغان زریں بازان!

کلام تو کلی مست (اژ کتاب سرمستِ بلوچستان)

ترجمہ :-

اے میرے دل! تو تموکی یاد میں کیا خیالات باندھتا ہے!

اے دل! اس کارواں کے ساتھ تو وابستگی کر، میں واپس لوٹتا ہوں،

اے میرے ساتھیو! آؤ پتھروں کو سوراخ کریں (فرہاد کی طرح) تاکہ گم ہو جائیں غم اور خونی غموں کو دفن کریں،

اے ریوڑ کی ملکہ! راتوں کی ساتھی، میں کیچ مکران سے تیرے پیچھے ہوں، تم یقین کرو میں تمہارے لئے دور دُور علاقوں میں بھاگا ہوں،

سندھ میں بہت سفر کرنے سے میری آنکھوں میں خون جم گیا ہے، میں وہ آدمی ہوں کہ میرے نام کے پیچھے اُمرا، مسور[1] کے کنارے سے آتے ہیں،

میں ہتھیاروں سے مسلح ہوتا ہوں اور اکثر تیرے پیچھے ناکہ کو تیار کرتا ہوں،

آدھی رات کے وقت تیرے لئے میں چپ پہاڑ کی بلندیوں پر آتا ہوں،

میں بے نام ہوں، میں درختوں کے پھل کھاتا ہوں، جنگلی انجیروں کے پھل اور سُرخ پتریک کا پھل کھاتا ہوں!

ہمجولیوں اور تیرے دوست (یعنی میں) نے اُسے کھایا،

فرشتوں نے اپنے زریں پروں کے ساتھ میرا پیغام اُٹھایا۔

(ترجمہ: از بلوچی شعر، مست توکلی)

ایک گدڑیا شاعر

جُمعہ کلوانی

جُمعہ خان کلوانی ' مری بلوچ قبیلہ کا ایک شاعر گزرا ہے ' وہ 1918ء میں 'سنڈائی' کے مقام پر پیدا ہوا ' اس کا گھرانہ آبائی طور پر دوسرے قبائلیوں کی نسبت آسودہ تھا ' اس کے والد کا نام کالو کلوآنی تھا۔

جمعہ خان فطری اور حقیقی شاعر تھا ' صغیر سنی ہی سے شعر کہتا تھا ، اس نے اپنے قبائل کے خیالات وجذبات کی صحیح ترجمانی کی ہے۔ عین عالم شباب میں یہ حقیقی شاعر ناسک (تحصیل ہرنائی) کے مقام پر چوروں سے لڑتا ہوا مارا گیا جو اس کے مویشی چُرانے آئے تھے۔ جُمعہ خان کو فوت ہوئے ایک عرصہ گزرا ہے مگر اس کے اشعار آج بھی مریوں کے مخصوص ساز ''نڑ'' پر گائے جاتے ہیں۔ اس کے اشعار زیادہ تر رُومانی ہیں ، جن میں سوزوگداز پایا جاتا ہے۔ اس نے اپنے بعض اشعار میں اپنے عوام کی غربت اور افلاس کا ذکر بھی کیا ہے لیکن وہ اس وقت نایاب ہیں۔ آج اس کی وہ رومانی نظمیں ہی پیش کی جاسکتی ہیں ' جن میں محبت اور انسانی جذبات کی صحیح عکاسی کی گئی ہے ' جمعہ خان کلوآنی شاعر تخلص کرتا تھا۔ نمونہ کلام کے طور پر یہاں اس کے دو شیئر (نظمیں) پیش کئے جاتے ہیں تاکہ اُس کے کلام کے متعلق صحیح اندازہ ہو سکے: ۔

گورغیں کہنی ترپتیں راہے رہگذی
ہر کسے حون ءِ حون اوار بیت ءَ مئے غوتھئ
سینغے بُوئی ئیں گراں دل گرتھہ منی

منڈاں پچاریں لڈوں رواں دیما کاشری
سوال گھوں ربا اکھڑیں ڈکھاں چھی مہ زئی
وچغیں وہاؤ بارغیں منڈا مودغاں!

O

ایک گوری کبوتری راہ جاتے ہوئے راستہ میں ملی'
میں نے اُسے کہا!
ہر کسی کا خون جدا ہے لیکن میرا اور تیرا خون ایک ہے ہم ایک ہیں!
وہ شرمائی!
اور میرا دل اُس کے خوبصورت سینے کے زیر و بم میں اُلجھ کر رہ گیا'
پھر میں نے سُنا!
بہت سی دوشیزائیں کہہ رہی تھیں'
ہمیں یہاں سے روانہ ہو کر چراگاہ میں جانا ہوگا'
میں نے اللہ تعالیٰ سے سوال کیا!
اے میرے رب!
میری محبوبہ کو اتنا دُکھ نہ دے' اسے سفر کی تکالیف سے بچا!!
اور پھر میں نے ایک دن نیند میں محو اس حسین و جمیل محبوبہ کو اُٹھا کر
اپنی آغوش میں چھپالیا۔

مذکورہ بالا نظم اس کی اپنی داستان حیات معلوم ہوتی ہے ایسی ہی ایک اور نظم یہاں پیش کی جاتی ہے جس میں شاعر اپنی محبوبہ کے حُسن و جمال کی تعریف کے بعد اپنی محبت کا اختتامیہ بھی دردناک انداز میں بیان کرتا ہے:

شگتی شیشغ برادرا کھارا
گون ئی گھاٹے حاکمی
چھکسو پٹیں جاباماں بستاں
زرنگاں تیرانی بھری'
جائی راست نازی تھئی یارے بُوانیں
آغربنچُنیں تعریف ءَ کھنی!
جھتین شئے چھمآن یار مَنی منیساء
شوا گشیں چھکے مڑدی؟
اے زامری چھیڑے فرشگے عرشی
موسماں پھلے پرُغی!
بستگاں ماسا گھنگرو پھاذاں
دیماں زراں نی بھری
ڈوبرا دیم ءَ چیلک کشتاں
دوستا ہپت رنگین ءَ سُری!
شیفگیں پوز ءَ تھنگویں پھلی
نے شواں ڈیوا ادا مئی بھلی
شہہ پری کھندی' بلغ تھئی دنتاں
کھور کھاں ہڑدوئیں دیدغاں
صورتیں چھکیں تھی ملغیں ڈیلا
چھو بجلی ے سیوی ءِ بلاں
موکل گپٹوں پرپغا پھلاں

تِکّے ٹوں گنجیں سیندھڑی
بانگھوے صُحوا بیتغا واہُو
وِرت تھی تنبُوئیں کھڑی
ڑپ تھی جیڑاں نی بھری
ونگلو سبزیں لیڑوا بستیں
نی لڈّ تا دشڑی!!

○

میں نے اپنے دوست شیشغ کو ساتھ لیا'
جس کے پاس حاکموں کی طرح گاروتھی'
میں نے اپنا کمر بند کس کر باندھا'
اور گولیوں سے بھرا ہوا تھیلا اٹھایا اس نے کہا'
واقعی تمہاری محبوبہ خوبصورت ہے'
یا تم یونہی تعریف کر رہے ہو!
میں نے کہا' دوست تمہاری آنکھوں میں وہ آدم زاد
ہے'
مگر میری نگاہ میں کچھ اور ہے!
وہ توزامری درخت کی بیش بہا جڑ ہے'
وہ عرش کا فرشتہ اور گلاب کا پھول ہے!
اُس کی ماں نے اس کے پاؤں میں پازیب ڈالی'
اس کے خوبصورت ماتھے پر'
سونے کی پٹی باندھی!

اس کے سینے پر ستاروں کی چیلک جگمگا رہی تھی'
اور سر پر سات رنگا دوپٹہ لہرا رہا تھا'
اس کی ستواں ناک میں سونے کی پُھلّی کچھ اس
طرح چمک رہی تھی'
جیسے رات کو شمع جلتی ہے'
وہ شہ پری جب ہنستی ہے تو اس کے دانتوں کی چمک
آنکھوں کو خیرہ کر دیتی ہے'
میری محبوبہ! تمہارے قد و قامت کی صُورت'
کچھ ایسے ہے' جیسے سَنی کی بتیاں جگمگا رہی ہوں'
میں نے اپنے پُھول (محبوبہ) سے اجازت چاہی'
کہ مَیں سرسبز سندھ کی طرف جاؤں گا'
لیکن جب صبح ہوئی تو آواز آئی کہ افسوس اُس کے
خیمے کی کڑی ٹوٹ گئی'
گویا اُس کی موت کا رسمی اعلان کر دیا گیا'
پھر اُس کے کانوں سے جھالر اور بُندے نکالے گئے'
اور اُس کی کشادہ چوٹی سے خوبصورت دھاگے
نکالے گئے'
آہ! میری بے نیاز محبوبہ کو اُونٹ پر لاد کر آہستہ آہستہ
اس کی قبر کی طرف لے جا رہے ہیں!!

000

بلوچی و براہوئی زبان کا ایک عوامی شاعر

تاجل

قدیم روایات اور تحقیق کے مطابق بروہی بلوچوں کے طائفہ اوّل سے ہیں چونکہ یہ طائفہ قبائل کی صورت میں کوہ البرز (ایران) سے یہاں وارد ہوا، اس لیے اس کی مناسبت سے اس کا نام بُرزکوہی پڑا، جو بعد میں بروہی مشہور ہوگیا، تاجل اسی طائفہ کا عظیم شاعر گزرا ہے، بعض بیرونی مورخین نے ''براہوئی'' کو ایک علیحدہ قوم بتایا ہے حالانکہ تاریخی طور پر یہ غلط ہے، بلوچوں میں قدیم سے دو قبیلے رہے ہیں، ایک صحرائی ایک کوہستانی بڑے بلوچوں نے ان میں امتیاز کی خاطر صحرائی کو ناروئی اور کوہستانی کو برزکوہی جو بعد میں دراوڑوں کے تلفظ سے بگڑ کر بروہی یا براہوئی رہ گیا، برز بذات خود بلوچی لفظ ہے جس کے معنی بلند اور اونچا کے ہیں بروہی زبان میں بھی یہ لفظ انہی معنوں میں بولا جاتا ہے شاید ایران کے اس مشہور پہاڑ کا نام البرز بھی انہیں بلوچوں نے رکھ دیا ہو اور فردوسی نے بھی اسی کے مطابق سے برزکوہ لکھا ہے، تاریخ بلوچستان حصہ اول میں محترم گل خان نصیر نے بروہی طائفہ کے متعلق غلط استدلال کے بارے میں ایک جگہ لکھا ہے۔

بعض غلط بین مورخین نے صرف زبان کی وجہ سے ''براہوئی'' قبیلہ کو دیگر بلوچ قبائل سے ایک علیحدہ قوم قرار دیا ہے، حالانکہ یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ زبان ہی مشترکہ قومیت کا باعث نہیں ہوسکتی، کسی قوم کی زبان پر وہاں کے ماحول اور گھر کی عورتوں کا بہت زیادہ اثر پڑتا ہے، مثلاً ان براہیوں کے عہد اقتدار میں جب بہت سی افغانی یا خالص بلوچی زبان بولنے والے قبائل ان کی پناہ میں آکر اس قبیلہ میں شامل ہوگئے اور براہیوں

شادی بیاہ کرنے لگے تو چند پشتوں میں اپنی مادری زبان کی طرح بولنے لگے یہاں
ک کہ آج اصل براہوئی اور ان نووارد براہوئی قبائل میں کوئی تمیز نہیں ہوسکتی اس حقیقت
بعد کہ بروہی بلوچ ہیں، مزید کوئی اختلاف نہیں رہتا۔ رہی زبان تو اس پر ماحول اور
کا اثر پڑتا ہے، بروہی زبان میں بلوچی الفاظ کے ساتھ دراوڑی زبان کے بگڑے
ے الفاظ ملتے ہیں جس سے ثابت ہوتا ہے کہ ان کی اصل زبان پر مقامی زبان کا اثر
ی پڑا ہے، مگر اب یہ ایک مستقل زبان ہے اور اس کا اپنا ادب بھی ہے۔ جس میں زیادہ
صہ کلاسیکی شاعری کا ہے اس زبان کا قدیم عوامی شاعر تاجل ہے، جو زمانہ حال ہی یعنی
1944ء میں 113 سال کی عمر میں فوت ہوا، تاجل کے کلام کا زیادہ حصہ عوامی شاعری
مشتمل ہے بلوچی اور بروہی زبان کے اس عظیم شاعر نے اپنی مادری زبان کے علاوہ
مقامی زبانوں میں بھی شاعری کی ہے، جس کا زیادہ حصہ بلوچی اور سرائیکی میں ہے، اس کی
شاعری کی طرح اس کی داستان حیات بھی بڑی دلچسپ ہے، زندگی کے نشیب وفراز اس
کے نزدیک کچھ زیادہ اہمیت نہیں رکھتے تھے۔ اس لئے ابتدائی شاعری کا حصہ طنز وتشنیع سے
بھرپور ہے، لیکن آخری حصے میں حزن وملال پایا جاتا ہے اور اس کی سب سے بڑی وجہ یہ
ہے کہ وہ اپنی زندگی کے آخری دور میں بصارت سے محروم ہوگیا تھا مگر اس واقعہ سے اس
کی شاعری میں کوئی فرق نہیں آیا بلکہ سوز وگداز نے اس کے جذبہ شعری کو اور زیادہ
گہرا کر دیا اور مشہور نابینا عرب شاعر اور فلسفی ابوالعلا معری کی طرح اس کے کلام میں پختگی اور
فصاحت وبلاغت بھی پیدا ہوگئی۔

تاجل کا اصل نام تاج محمد تھا، شاعر ہونے کی وجہ سے تاجل اس کا تخلص تھا،
اس کا باپ درمیانہ درجہ کا زمیندار تھا۔ اس لئے بچپن گاؤں کی گلیوں اور اپنے کھیتوں پر
گزرا اکثر اپنے باپ کے ساتھ کھیتوں پر جاتا اور اس کا ہاتھ بٹاتا جب جوان ہوا تو
کھیتوں سے متعلق تمام کام خود سنبھال لیا اس عرصے میں وہ کھیتوں پر اپنے جاگیرداروں

کے ظلم وستم جو وہ اپنے مزارع (بزگروں) سے روا رکھتے تھے دیکھا کرتا اور اس
سلوک سے اسے بہت کوفت ہوتی اس نے اپنے بعض اشعار میں اس کی طرف
ہے اور کہیں تو وہ اس سلوک کے خلاف احتجاج بھی کرتا ہے۔

ترجمہ:

تم اگر انسان ہوتے'
صاحب ایمان ہوتے'
پاک پرور کی قسم'
ہرگز نہ کرتے یہ ستم'
وہ بھی تو انسان ہیں'
صاحب ایمان ہیں'
تو یہ حیوانی سلوک'
اس پر ستم' فاقہ و بھوک'
حیران ہوں کہ روز جزاء
تم کو ملے گی کیا سزا؟!

یہیں سے اس کی شاعری کی ابتداء ہوئی'

شاعری قدرت کا ایک عطیہ ہے' اور تاجل کے متعلق ایک مشہور روایت ہے کہ اُسے یہ عطیہ چہار بزرگ ہستیوں کی صحبت سے حاصل ہوا' ایک رات وہ بے قراری کے عالم میں گھر سے نکلا' اور اپنے کھیتوں کا رخ کیا لیکن راستے میں بھٹک جانے کی وجہ سے ایک کھلے میدان میں جا پہنچا' جہاں اسے چار شخص بیٹھے ہوئے نظر آئے' جب وہ ان کے قریب گیا انہوں نے اسے بیٹھنے کو کہا اور اس سے احوال پُرسی کے بعد قرآن پاک کی کچھ آیتیں سنانے کی فرمائش کی۔ تاجل نے بچپن میں قرآن کی کچھ آیتیں حفظ بھی کی تھیں

...ش الحان بھی تھا۔ اُس نے اس فرمائش کی فوراً تکمیل کی جس کے صلے میں ان
...ں نے خوش ہوکر اس کے حق میں شاعر ہونے کی دعا کی اور اسے شاعری کا
...ہو گیا۔ اپنے ایک قطعہ میں وہ عطیہ شاعری کے اس واقعہ کا اس طرح ذکر کرتا تھا:

پاک مُرسل کے بچے
چار یاروں کے طفیل،
شاعری مجھ کو ملی،
مَیل بھی دل سے دُھلی
شُکر کرتا ہوں سدا،
دل کا ملا ہے مدعا،

سرائیکی زبان میں بھی اس عطیہ کے متعلق ایک قطعہ کہا ہے:

لالہ دا سر لال ہویا
خود مالک دا اقبال ہویا،
گل وچ ہسی کن وچ کنڈل
تاج کلنگی نال ہویاء!!

تاجلؔ نے اپنی شاعری میں جہاں اپنے ملک کے غریب لوگوں کی ترجمانی کی
...ں معرفت کی کچھ باتیں بھی کہی ہیں، چونکہ اس دور میں تصوف و معرفت کا چرچا تھا،
...ئے تاجلؔ نے بھی اکثر اشعار اس رنگ میں لکھے ہیں اپنی ایک غزل میں وہ اس
...کو اس طرح پیش کرتا ہے:

آپ ﷺ (رسول کریم ﷺ) کا قد بلند
اور خوبصورت ہے،
آپ کے وجود مُبارک کی خوشبو مشک کی

طرح اور آپ کا چہرہ مبارک کسی بزی
شمع کی طرح روشن ہے'

جو بد بخت شخص آپ ﷺ سے منکر ہوا وہ چکی کے ایک پٹ کی طرح ہے جو کسی کام نہیں آسکتا دنیا میں پریشانی اور بیقراری ہے اور جہاں بھی جاؤ لق ودق صحرا کی طرح کوئی آبادی نہیں۔

تاجؔ کی اکثر غزلوں میں تصوف کا رنگ پایا جاتا ہے' اس نعتیہ کلام میں بھی تصوف کے نکات بیان کئے گئے ہیں وہ اس میں رسولِ کریم ﷺ کے چار یاروں کی تعریف کرنے کے بعد تصوف کے ذریعے کچھ باتیں سمجھاتا ہے:

''حضرت ابوبکر صدیقؓ اپنے صدق پر ثابت قدم رہے'
حضرت عمرؓ، گوہر' اور یاقوت کی طرح چمکتے ہیں'
حضرت عثمانؓ اللہ تعالیٰ کے خاص غنی تھے'
اور حضرت علیؓ آپ سے سیدوں کا حسب نسب ہے'
آپ سب رسولِ خدا کے دوست اور اللہ کے مقرب ہو'

یارسول اللہ ﷺ میں تو آپ کا دیوانہ ہوں اور آپ ﷺ کے بعد آپ کے یاروں کی تعریف کرتا ہوں' بغیر دوست کے زندگی کوڑھ کی طرح ہے' جس سے نجات مشکل ہے' اور اپنے دوست کی تعریف ہی سب سے بہتر چیز ہے' لیکن صفت وثنا صرف اللہ تعالیٰ کے لئے ہونی چاہئے!

تاج محمد کا یہ قول یاد رکھو' کہ دوستی بے غرض ہو اور ہمیشہ سیّد اور فقراء کے ساتھ ہونی چاہئے۔

اپنے باپ کی وفات کے بعد وہ زیادہ دنوں تک اپنے گاؤں ''گلن'' میں نہ ٹھہر سکا' اب اس پر اکثر مستی کا عالم طاری رہتا تھا' اس لئے وہ بہت جلد اپنے کھیتوں کو کاشتکاروں کے حوالے کر کے آزاد ہوگیا' اس کے بعد 'دشت پیمائی' اس کا مشغلہ بن

گیا۔ اکثر فقیروں کی صحبت میں رہتا جب ان سے فرصت ملتی جنگل کی طرف نکل جاتا اور فکرِ شعر و سخن میں پہروں غرق رہتا۔ دس برس اسی حالت میں گزر گئے اب وہ اپنے عوام میں مقبول ہو چکا تھا' اس کا کلام ''یک تارا'' پر گایا جاتا تھا' وہ جہاں جاتا اس کی قدر اور حوصلہ افزائی ہوتی اور لوگ اس کے کلام کو اس کی زبان سے سن کر بے حد محفوظ ہوتے وہ اسی زمانے کا واقعہ ہے' ایک دن وہ قصبہ ''تیری'' میں اپنے ایک درویش دوست کو ملنے گیا' وہاں کے لوگوں نے اسے اپنا کلام ترنم سے سُنانے پر مجبور کیا' تاجلؔ خوش الحان تھا' اس کی آواز نہایت سُریلی اور زور دار تھی جہاں وہ یک تارا پر اپنی غزل گا رہا تھا وہاں قریب ہی گاؤں کے ایک زمیندار کا ایک مکان بھی تھا۔

وہاں سے ایک حسین و جمیل خاتون نے جھانک کر تاجلؔ کو دیکھا اور کچھ دیر محویت کے عالم میں رہی۔ تاجلؔ کی بھی اس پر نگاہ پڑ گئی محبت کا جادو چل گیا' اور دونوں ایک دوسرے کے لئے تڑپنے لگے' تاجلؔ نے اپنے درویش دوست کے ذریعے اس خاتون کی والدہ کو شادی کا پیغام بھیجا' جو کچھ پس و پیش کے بعد قبول کر لیا گیا' تاجلؔ کی لعلینؔ کے ساتھ شادی ہو گئی۔

گویا شاعر کی اُجڑی ہوئی دنیا آباد ہو گئی۔ وہ لعلینؔ کو اپنے گھر لایا اور دونوں خوشی سے رہنے سہنے لگے' اس واقعہ کے قریباً آٹھ سال بعد جب تاجلؔ کا بڑا لڑکا جو پہلی بیوی کے بطن سے تھا' سخت بیمار ہوا اور اس کے بچنے کی کوئی امید باقی نہ رہی تو تاجلؔ نے بارگاہ الٰہی میں گڑ گڑا کر دعا مانگی' کہ اللہ تعالیٰ صادقؔ کو شفا عطا فرما' اسے اس مرض سے نجات دے' اس کے عوض میں میری آنکھیں بینائی سے محروم ہو جائیں' دعا قبول ہوئی صادقؔ روز بروز ٹھیک ہونے لگا اور تاجلؔ بیمار پڑ گیا' یہاں تک کہ مرض کی شدت نے اس کی بینائی چھین لی' جب مرض سے نجات ملی تو اس نے خود کو ہر طرف سے تاریکی میں گھرا ہوا پایا' وہ شاید زندگی بھر اس تاریکی میں بھٹکتا رہتا۔

مگر اُس کی درویشانہ طبیعت نے اسے معرفت کی روشنی عطا فرمائی جس کے ذریعے اس نے اپنی بقیہ زندگی ہنسی خوشی سے بسر کی۔ آنکھوں کی بینائی قدرت کی بہت بڑی نعمت ہے' اس نعمت سے محروم انسان چونکہ دنیا کے حسین نظاروں اور کائنات کی دلفریبیوں سے محروم ہوجاتا ہے' اس لئے اس کی زندگی نہایت ہی بے لطفی اور محتاجی سے گزرتی ہے' لیکن جو اپنی زندگی کا ایک مقصد بنالیتا ہے اس کی یہ بے کیف اور تاریک زندگی امید کے سہارے آرام سے بسر ہوتی ہے۔ تاجلؔ نے اپنی زندگی کا مقصد پہلے ہی سے متعین کرلیا تھا' اس لئے اسے بصارت سے محرومی کا زیادہ ملال نہیں ہوا' وہ تخلیق شعر وسخن میں کچھ اس قدر مستغرق ہوگیا کہ اس کوفت کو بھی بھول گیا' جو آنکھوں سے محروم انسان کو مغموم رکھتی ہے' عمر کے ساتھ ساتھ اس کے فن میں بھی پختگی آتی گئی کیونکہ اس کی زبان میں بھی تاثیر تھی' اس لئے اس کا کلام کبھی بے اثر ثابت نہ ہُوا اس کی شخصیت اور فن کی بہت قدر ہوئی' یہاں تک کہ جب وہ بوڑھا ہوگیا' اور لعلینؔ نے اس کے ساتھ رہ کر اسے تمام باتوں سے بے نیاز کردیا تھا' اس وقت بھی لوگ اسے آرام سے نہیں بیٹھنے دیتے تھے اسے محفلوں میں بلایا جاتا' وہ اپنا کلام ترنم سے سناتا لعلینؔ بھی اس کے ساتھ مل کر گاتی اور اس طرح تاجلؔ اور لعلینؔ نے براہوئی ادب کو گیتوں سے مالامال کردیا' تاجل 113 برس کی عمر میں فوت ہوا اور لعلینؔ نے اس کے چار سال بعد وفات پائی۔ تاجلؔ کے گیت اور اس کے نغمے آج بلوچی اور براہوئی ادب کا بہترین سرمایہ ہے۔

O

غزل

نمونہ کلام.......تاجلؔ

وطن ء ظہیراں عُمری یار تھسیں آں
مولاگوں تھومیلی وہی خیال تھسیں آں
عشق چھون گونجیں چھ کارگیلی
شف روش گرداں مناں آرام گیلی
عشق چھوں گونجیں مجنا او لیلی
بلبل ماں باغ ء مثل ءِ چہار وہی
وطن ء ظہیراں عُمری یار تھسیں آں!
مولاگوں تھومیلی وہی خیال تھسیں آں!
تھرا نہ کندغاں چھتاں چھ کھورآں
اللہ مارا دیغے پہلوانی زور آں
کھنن آہو کجلی سر پرتھو گھورآں
وطن ء ظہیراں عُمری یار تھسیں آں
مولاگوں تھومیلی وہی خیال تھسیں آں
چکمیں دنتھان ء ولدار تھسیں آں
لب لعل موتی جنہوار تھسیں آں
کھین آہو کجلی دیدار تھسیں آں
وطن ء ظہیراں عُمری یار تھسیں آں

مولاگوں تھومیلی دہمی خیال کھسیں آں
اے دنیا تہا ماں ون نہیں نہ دائسو
بُت ئیں بھوریں تھو بتائیں تھسیں گھاٹو
ماراد ے ژُڑتھ جنگی عشق تھیرآں
وطن ءَ ظہیراں عُمری یار تھسیں آں
مولاگوں تھومیلی دہمی خیال کھسیں آں

O

ترجمہ:۔

وطن کے لئے اُداس ہُوں!
عمر بھر کیلئے اے دوست تیرا ہی رہوں گا
اللہ تعالیٰ تجھ سے مِلائے مجھے تیرے سوا
کسی اور کا خیال کب آسکتا ہے؟!
عشق ایسا پاگل ہے کہ عجیب سے خیالات لاتا ہے؛
رات دن سرگردان ہُوں مجھے کہیں آرام نہیں ملتا؛
عشق ایسا دیوانہ ہے جیسے کہ مجنوں اور لیلیٰ تھے؛
اس عشق کی وجہ سے چودھویں کی رات کو بھی بلبل
نے دن سمجھ رکھا ہے؛
وطن کے لئے اُداس ہُوں!
عمر بھر کیلئے اے دوست تیرا ہی رہوں گا؛
اللہ تعالیٰ تُجھ سے مِلائے مجھے تیرے سوا کسی اور کا
خیال کب آسکتا ہے؟!
تجھے نہیں دیکھتا ہُوں تو اندھا ہو جاتا ہوں؛

اللہ تعالیٰ نے اپنی مہربانی سے مجھے پہلوانوں کی سی
طاقت دی ہے'
(اس کے باوجود) اے آہو چشم سر تجھ پر قربان ہے'
وطن کے لئے اُداس ہُوں' عمر بھر کے لئے اے
دوست تیرا میں رہونگا'
اللہ تعالیٰ تجھ سے ملائے مجھے تیرے سوا
کب کسی کا خیال آسکتا ہے!
اے موتی جیسے خوبصورت دانتوں والی محبوبہ میں تجھے
دل دے چکا ہوں'
تیرے ہونٹ لعل وجواہر کی مانند ہیں'
اے آہو چشم تیرے دیدار کا خواہاں ہُوں!
وطن کے لئے اُداس ہُوں عمر بھر کے لئے اے
دوست تیرا ہی رہوں گا'
اللہ تعالیٰ تجھ سے ملائے مجھے تیرے سوا کب کسی کا
خیال آسکتا ہے؟
اس دنیا میں میرا کوئی نہیں ہے'
میری جان کو تو نے کوہلو کی طرح نچوڑ ڈالا ہے'
عشق کی سختیوں کو برداشت کرنے کا مجھ میں جذبہ
پیدا ہوگیا ہے!
وطن کے لئے اُداس ہُوں' عمر بھر کے لئے اے
دوست تیرا ہی رہونگا'
اللہ تعالیٰ تجھ سے ملائے مجھے تیرے سوا کب کسی کا
خیال آسکتا ہے'

ooo

بلوچی و براہوئی زبان کا جیّد عالم اور مصلح

مولانا محمد فاضل دُرخانیؒ

قلات ڈویژن کے سنگلاخ خطے میں جہاں ایک صدی قبل خنک پہاڑوں اور ویران میدانوں کے سوا حیات انسانی کے لئے کچھ بھی نہیں تھا' جہاں درندہ صفت لوگوں کے ٹھکانوں کے سوا کوئی آبادی نہ تھی' وہاں بھی مخلوقِ خُدا کی رہنمائی کے لئے کچھ ایسی برگزیدہ ہستیاں گزری ہیں' جن کی قیادت اور رہنمائی میں بہت سے لوگوں نے فیض پایا۔ حضرت مولانا دُرخانیؒ بھی اُن ہستیوں میں سے ایک تھے' ان کے دور میں یہاں کے عوام جو جہالت اور لادینی کی زندگی بسر کر رہے تھے' علم کی دولت اور دین کی نعمت سے پُورے طور پر فیض یاب ہوئے۔

سابق بلوچستان میں تحریکِ آزادی اور شعوری بیداری کی لہر انگریزوں کی آمد سے شروع ہوئی' اس میں بعض علماء وفضلاء نے بھی حصہ لیا۔ مولانا محمد فاضل دُرخانیؒ بھی اس کام میں پیش پیش رہے' لیکن ان کا طریق کار اپنے ساتھیوں سے مختلف اور جُداگانہ تھا۔ وہ اپنے دور کے جیّد عالم ہی نہیں مجاہد بھی تھے' انہوں نے انگریزوں کے خلاف اس وقت کے دستور کے مطابق تبلیغ کے علاوہ عملی جہاد بھی کیا۔

مولانا موصوف اس دورِ جہالت میں پیدا ہوئے تھے' جب قلات اور کوئٹہ (سابق بلوچستان) کے ویران خطے میں طوائف الملوکی کا دور دورہ تھا' اور یہ حالت نصف صدی تک وہی' چنانچہ جب مولانا جوان ہوئے۔ انہیں دو ایسے ساتھی ملے، جنہوں نے اس دور کے مطابق انہیں بھی اکسایا اور انگریزی فوجوں پر حملہ کرنے اور انہیں لوٹنے کے کام پر آمادہ کیا۔ یوں بھی اس وقت یہ کام معیوب نہ تھا' کیونکہ انگریزی دورِ حکومت کی ابتداء تھی' اس لئے لوٹ مار اور ڈاکہ زنی کا شمار انگریزوں کے خلاف جہاد میں سے تھا اور

اس طرح بسر اوقات کرنا بہادری میں شامل تھا' بلکہ بعد میں اکثر لوگوں کا ذریعہ معاش بھی یہی کام تھا' چنانچہ مولانا کے دونوں ساتھی جو نکل اور بینکل مری بھی جوڈا کے ڈالتے اور انگریزوں کے ٹھکانے پر حملہ کرتے تھے' انہیں بھی اپنے ساتھ رکھتے' جہاں زور ولڑائی ہوتی' مولانا اسے جہاد سمجھ کر انگریزوں پر حملہ آور ہوتے' اور اس طرح اپنے ساتھیوں کا ہاتھ بٹا کر داد شجاعت دیتے۔ ایک رات جب گھپ اندھیرا تھا اور ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہیں دیتا تھا' مولانا کے ساتھی ایک بڑے جاگیردار کے گھر نقب لگانے روانہ ہوئے' مولانا اس کام کیلئے رضامند نہ تھے کیونکہ ان کا مقصد تو صرف جہاد تھا' تاہم ان کا ساتھ دینا بھی ان کے لئے ضروری تھا' مگر آج وہ بے حد مغموم تھے' اس لئے بادل ناخواستہ ایک چھوٹی پہاڑی کو مورچہ بنا کر بیٹھ گئے۔ آج ان کی حالت دگرگوں تھی اور وہ کسی فیصلے پر پہنچنا چاہتے تھے' اسی تذبذب میں تھے کہ پیچھے سے کسی نے سر پر مکا دے مارا' اور کڑک کر کہا' "محمد فاضل یہ کام چھوڑ دو" مولانا نے مڑ کر دیکھا تو وہاں کوئی موجود نہ تھا۔ انہیں غصہ آیا' اور مکا مارنے والے کو چیلنج کیا' کہ سامنے آجاؤ چھپتے کیوں ہو؟ مگر وہاں کوئی شخص ہوتا تو نظر آتا وہ تو خضری کوئی ہستی تھی' جس نے مشیت ایزدی کے طور پر ہدایت کے لئے ایسا کیا' لیکن مولانا غصے میں بھرے ہوئے تھے کسی پہلو میں چین نہیں آتا تھا' آخر کچھ دیر کی سوچ بچار کے بعد اپنے ساتھیوں کو وہاں چھوڑ کر مغموم حالت میں گھر آئے' رات کروٹیں بدلتے ہوئے گزری صبح ہوئی تو مسجد گئے اور زندگی میں پہلی بار خلوصِ دل سے بارگاہ ایزدی میں حاضر ہو کر تائب ہوئے' لیکن پھر بھی دل میں ایک خلش سی رہنے لگی اس لئے اکثر مغموم رہتے تھے' جیسے کوئی قیمتی شے کھوگئی ہے' آخر ایک دن وہ شے انہیں مل گئی' جس کے لئے سرگرداں تھے۔ تائب ہونے کے بعد ان کے دل میں دین پڑھنے کی لگن پیدا ہوئی' وہ جانتے تھے کہ اس کے لئے تعلیم حاصل کرنا ضروری ہے' لیکن تعلیم کس طرح حاصل کی جائے؟ جبکہ قُرب وجوار میں دور تک کوئی دینی مدرسہ نہیں ہے'

چنانچہ مولانا موصوف تعلیم کی آرزو میں بیقرار رہنے لگے اس بیقراری میں بزرگان دین نے روحانی طور پر ان کی طرف توجہ دی' اس سلسلے میں یہ روایت مشہور ہے' کہ حضرت خضرؑ اور چار ابتدائی یاروں نے انہیں مستفیض کیا' اور وہ ان کی ہدایت پر دین کی اہم باتوں سے واقف ہوئے' اور ان کا یہ اضطراب دُور ہوا' لیکن ابھی شاید کچھ کمی باقی رہ گئی تھی' قدرت کی طرف سے اس کے اسباب پیدا ہو گئے' اور ایک واقعہ نے اس کی زندگی کی کایا ہی پلٹ دی۔

ایک دِن شام کو جب موصوف مٹھڑی سے اپنے قصبہ ''درخان'' تنہا جا رہے تھے دو ڈاکوؤں نے انہیں لُوٹ لیا بلکہ یہاں تک کہ انہوں نے مولانا کے تمام کپڑے بھی اُتار لئے' اور صرف لنگوٹی پہنا کر انہیں چھوڑ دیا' ان کے لئے یہ باعث ننگ تھا' کہ وہ اس حالت میں اپنے گھر جاتے' کیونکہ انہیں ہر شخص پہچانتا تھا' وہ اعلیٰ خاندان اور بلوچوں کے قبیلہ رئیسانی سے تعلق رکھتے تھے۔ بہت غور وفکر کے بعد آخر انہوں نے قصبہ ''ہمایوں'' جانے کا تہیہ کیا' وہاں مولوی عبدالغفور ہمایونی کا ایک زبردست مدرسہ تھا' جہاں دینی تعلیم مفت دی جاتی تھی' اور قیام وطعام کا بندوبست بھی مدرسے کے ذمے تھا' مولانا نے اپنی حالت کو مکمل طور پر بدلنے کیلئے وہاں کا رُخ کیا' مولوی ہمایونیؒ صاحب خدارسیدہ بزرگ تھے' مولانا نے ان سے کسب فیض کیا' اور دین سے متعلق ہر طرح کی تعلیم حاصل کی' چنانچہ دوسال کے بعد جب وہ اپنے وطن کو لوٹے' تو انہیں سب کچھ حاصل ہو چکا تھا۔

''قصہ دُرخان'' میں جہاں مدرسہ تو کیا' کوئی تعلیم یافتہ شخص تک بھی نہیں تھا' مولانا نے اپنے گھر کے قریب مسجد بنوائی' اور اس کے احاطہ میں ایک مدرسہ کھول دیا جہاں باقاعدہ درس وتدریس کا سلسلہ شروع ہو گیا' ہر نماز کے بعد مولانا موصوف خود بھی وعظ فرماتے۔ زبان میں اس قدر تاثر تھی' کہ جو شخص ان کا وعظ سنتا' گناہوں سے تائب ہو کر نیک اور پارسا بن جاتا۔ جب نوبت یہاں تک پہنچی' تو قرب وجوار کے لوگ بھی وعظ سننے کے لئے آنے لگے' اب ان کے ہاں ایک جم غفیر سا لگا رہتا' دین کی باتیں ہوتیں مسئلے مسائل پوچھے جاتے'

بعض لوگ انتہائی عقیدت کی وجہ سے ان کے حلقہ ارادت میں بھی شامل ہو جاتے۔

خلقِ خدا کی بے مُزد خدمت اور عبادت و ریاضت نے ''مولانا'' کو ولایت کے عظیم مرتبہ پر پہنچا دیا' چنانچہ باہر سے آنے والوں کیلئے ''لنگر'' کا قیام عمل میں لایا گیا' جہاں مسافروں کو فی سبیل اللہ صبح و شام کھانا ملتا' اور ان کے رہنے کے لئے چار پانچ بڑے کمروں پر مشتمل ایک سرائے بھی تعمیر کرائی گئی' عقیدت مندوں کے لئے ایک علیحدہ بڑی بیٹھک بنوائی' جس کے کھنڈر آج بھی اُسی شان و شوکت کی نمائندگی کرتے ہیں۔ قصبہ دُرخان' اب مولانا کے فیض سے علم و ادب کا مرکز بن گیا تھا' طالبانِ حق اس سرچشمہ سے اپنی پیاس بجھاتے اور دعائیں دیتے ہوئے اپنے گھر جاتے' اس طرح ریاست قلات کا وہ مشرقی حصہ جو چند سال قبل ڈاکوؤں اور لٹیروں کا مسکن تھا' اب وہ جاہل عوام کے سُدھر جانے سے امن و امان کا گھر بن گیا' لیکن ابھی مولانا کو بہت کام کرنا تھا ان کے پیش نظر دین کی تبلیغ کے علاوہ جاہل عوام کو شائستہ بنا کر فرعون مزاج جاگیرداروں سے آزادی دلانا تھا۔ اسی طرح فضول رسوم اور بدعات کا قلع قمع بھی کرنا تھا چنانچہ طے شدہ پروگرام کے مطابق ابتداء قصبہ جات میں تبلیغ کرنے سے ہوئی۔ لہٰذا مولانا موصوف اب اکثر اپنے گھر سے باہر رہتے' متفرق قصبوں اور شہروں میں دینِ حق کی تبلیغ کرتے' جہاں جاتے تنہا جاتے' کسی کے مہمان نہ ہوتے تھے' حالانکہ ہر جگہ ان کے عقیدت مند موجود تھے' لیکن مولانا کسی کے گھر کا کھانا نہ کھاتے' کیونکہ تبلیغ کے دوران میں وہ اس بات کو بھی معیوب سمجھتے تھے' اس لئے گیہوں کے ستوؤں کی ایک بڑی سی پوٹلی سفر کے دوران ساتھ رکھتے' قیام کے وقت روٹی کے بجائے تھوڑے سے ستو اور گُڑ پوٹلی سے نکال کر ایک کٹورے میں بھگو کے کھا لیتے' اور رات پڑنے پر کسی مسجد میں عبادت کیلئے ٹھہر جاتے۔

جب مولانا کی تبلیغ اور مخلوق خُدا سے نیک سلوک کا اثر پھیلنے لگا' عوام میں بُرے بھلے کا پورا پورا شعور پیدا ہو گیا' اور وہ دین کے متعلق تمام باتوں سے آگاہ ہو گئے' تو مولانا نے اپنے دور کے بڑے بڑے عمل عالموں اور بدمزاج شخصیتوں کے خلاف قلمی

اور عملی جہاد شروع کیا' اس کام میں انہیں بڑی تکالیف کا سامنا کرنا پڑا' مخالفین کا ایک گروہ پیدا ہوگیا' اور بحث ومناظروں کا تانتا بندھ گیا' لیکن حضرت مولانا کی حق گوئی اور پُرتاثیر زبان کے سامنے کوئی نہ ٹھہر سکا اپنا سامنہ لے کر واپس جانا پڑا۔

اس طرح مولانا نے دین حق کو علاقہ قلات اور کوئٹہ کے گردونواح میں از سر نو چمکایا' گمراہ اور دین سے پھرے ہوئے لوگوں کو راہ ہدایت دکھائی' علم وعرفان سے حق پرستوں کے سینوں کو منور کیا' یہاں تک کہ معاشرت وثقافت سے متعلق جاہلانہ رسوم کی بھی اصلاح کی۔ اس کے دور کے بلوچوں کی لمبی شلواروں کو سادہ شلوار کی صورت میں تبدیل کرایا' فضول لباس کو ممنوع قرار دیا' جیسا کہ ''افازۃ المصلّی'' کے مصنف مولانا عبداللہ دُرخانی اپنی تصنیف میں ایک جگہ لکھتے ہیں:

> ''حضرت مولانا محمد فاضل دُرخانی نے سردار حاجی مُلا محمد خان رئیسانی جاگیردار مٹھڑی کو ایک موقع پر جبکہ وہ اپنے فرزند ''اسد اللہ خان'' کے ہمراہ آپ کی زیارت کو آئے تھے حضرت موصوف نے انہیں اسد اللہ خان کے کانوں سے سونے کی بالیاں نکال دینے کو کہا کہ شرع انور میں ممنوع ہیں اور سردار رئیسانی کو ہدایت فرمائی کہ آپ بھی بڑی شلوار نہ پہنا کریں' شرع اس بات کی اجازت نہیں دیتی' چنانچہ سردار موصوف نے گھر پہنچ کر ہردو ہدایات پر عمل کیا اور ان کی دیکھا دیکھی خاندان کے باقی افراد نے بھی ان چیزوں کو بُرا سمجھ کر ترک کردیا''۔

[1] نواب رئیسانی سر اسد اللہ خان مرحوم

صرف یہی نہیں' اس طرح کی بہت سی اصلاحی باتیں ہیں' جو مولانا موصوف کے فیض سے ظہور پذیر ہوئیں۔ انہوں نے علاقہ قلات وکوئٹہ (سابق بلوچستان) کے جاہل عوام کی صرف اصلاح ہی نہیں کی' بلکہ انسانیت پر بھی بڑا احسان کیا۔ وہ خطہ زمین جہاں شب وروز ڈاکے پڑتے تھے' اور قتل وغارت گری بہادری کا کام سمجھا جاتا تھا' وہاں ایسا امن وامان ہُوا کہ اس کی مثال بہت کم ملتی ہے۔ اب ثقافت کی اصلاح کے وہ کام جو بڑے بڑے جابر حاکم نہ کر سکے ایک فقیر سیرت درویش نے اپنے کردار وعمل اور اعلیٰ اخلاقی تعلیم سے پورے کر دکھائے۔ انہوں نے اس خطے کے درندہ صفت آدمیوں کو مکمل انسان بنا کر ان کے لئے ایک ایسا درس چھوڑا جس کے لئے یہاں کے لوگ اور ان کی نسلیں کبھی فراموش نہیں کر سکیں گی۔

بلوچی ادب وثقافت پر بھی انہوں نے چند کتابیں مرتب کرائی تھیں' جن میں اکثر دینی مسائل کے ذریعے ثقافتی اصلاح وبہبود کو پیش کیا گیا ہے' یہ تصانیف بلوچی اور بروہی زبان میں ہیں' ان کے علاوہ قرآن حکیم کا ترجمہ بلوچی وبروہی زبان میں مولانا کی نگرانی میں ہُوا جو بے حد مقبول ہوا' اور آج بھی اُسی قدر ومنزلت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔

تبلیغ اور تصنیف وتالیف کے علاوہ مولانا موصوف کا خاص مشغلہ اپنے دور کے علمائے حق' ولی اللہ' اور دیگر بزرگ ہستیوں سے تبادلہ خیال کرنا تھا' اور اس زمانے کے علمائے کرام اور ولی اللہ میں سے خاص طور پر چند ہستیاں قابل ذکر ہیں۔ چنانچہ حضرت پیر شاہ ابوالخیر صاحب دہلویؒ (جن کے نام پر ''شارع پیر ابوالخیر'' کوئٹہ میں ایک کوچہ بھی ہے)۔

حضرت حافظ محمد ابراہیمؒ بھر چونڈی علاقہ سابق سندھ' حضرت خواجہ محمد جان بابکؒ ساکن کدنی علاقہ قندھار' حضرت خواجہ میاں فیض الحقؒ چشموی کوئٹہ' حضرت حاجی محمد صدیق ساکن مستونگ' حضرت مولانا عبدالرحمٰنؒ سکھر والے اور حضرت محمد ابراہیمؒ سندھی

سرحدی یہ سب حضرت مولانا محمد فاضل درخانیؒ کے ہمعصر اور احباب میں سے تھے، جو موسم سرما میں ''قصبہ دُرخان'' میں مولانا سے ملنے آتے، محفلیں جمتیں، اور معرفت وحکمت کے تذکرے ہوتے۔

آخر بتیس برس تک تبلیغ واصلاح کا کام سرانجام دینے کے بعد یہ عظیم ہستی اپنے دور کا یہ بے مثل مجاہد، اسلامی ادب وثقافت کا علمبردار، 19 ماہِ شوال 1314ھ بمطابق 1892ء بروز منگل اپنے احباب اور عقیدت مندوں کو داغ مفارقت دے کر اس جہان سے کوچ کر گیا، اور اس کے بعد یہاں پھر کوئی دانائے راز پیدا نہ ہوا، جس کے متعلق حکیم الامتؒ نے فرمایا ہے:

سالہا درکعبہ وبُت خانہ می نالد حیات
تا زبزم عشق یک دانائے راز آید بُرون

ooo

مولوی حضور بخش رح

مولوی حضور بخش جتوئی اپنے دور کے بڑے عالم اور شاعر تھے' ابتدائی ایام زندگی دورِ جہالت میں گزارے۔ قصبہ دُرخان سے فیض حاصل کرنے کے بعد علاقہ سنّی (ضلع کچھی) کے ایک چھوٹے سے گاؤں' تائب' میں ایک دینی مدرس کی حیثیت سے رہنے لگے وہاں وہ لوگوں کو باقاعدہ درس دیا کرتے تھے۔

ابتدائی حالات یوں ہیں کہ حضرت مولانا محمد فاضل درخانی" جب تبلیغ کے سلسلے میں اس بے نام قصبہ "تائب" میں آئے تو یہاں کے لوگ دینی لحاظ سے قطعی نابلد تھے۔ مولانا موصوف' نے یہاں تبلیغ کی اور ان کے پُرتاثیر وعظ کے نتیجے میں قصبہ کے لوگوں کی ایک بڑی اکثریت نے نصیحت حاصل کی اور اپنی بداعمالیوں سے تائب ہوئے چنانچہ حضرت مولاناؒ نے اسی مناسبت سے اس قصبے کا نام "تائب" رکھا اور مولوی حضور بخش کو (جو مولاناؒ کے حلقہ ارادت میں شامل ہو چکے تھے) ان پر مدرس مقرر کیا، درس و تدریس کا یہ سلسلہ ان کی زندگی تک جاری رہا اور اس علاقہ کے لوگ مستفیض ہوئے۔

مولوی حضور بخش" نے عربی زبان کی بعض مستند درسی کتب کا منظوم ترجمہ کیا اور کچھ تصانیف بھی کیں۔ یہ تمام کُتب قریب قریب منظوم ہیں' اور اب بلوچی زبان کا گراں قدر سرمایہ ہے۔ مولوی حضور بخش" کی شاعری سے متعلق مولوی عبدالباقی دُرخانی نبیرہ حضرت محمد فاضل" دُرخانی سے روایت ہے کہ جب قصبہ "تائب" کے باشندے دیندار بن گئے تو قرب وجوار کے لوگوں نے ان پر طنزیہ اشعار کہے اور ہر محفل میں طنزیہ اشعار کے

ذریعے انہیں استوار کرنے لگے' اہلِ تائب اس حالت سے بہت مغموم رہنے لگے۔ مولوی حضور بخشؒ نے ایک ملاقات میں حضرت مولانا محمد فاضل دُرخانیؒ سے اس کا تذکرہ کیا انہوں نے فرمایا کہ ''ان جہلاء کے ملنز یہ اشعار کا جواب آپ بھی اشعار میں دیں'' مولوی صاحب نے عرض کیا کہ مجھ میں شاعری کی صلاحیت نہیں اگر ایسا ہوتا تو یقیناً میں ان کا جواب دیتا' چنانچہ اس موقعہ پر حضرت مولاناؒ کچھ لمحے خاموش رہے اور پھر دعا کے لئے ہاتھ اٹھائے' دُعا کو شرف قبولیت حاصل ہوا' چنانچہ اگلے روز مولوی صاحب اشعار کہنے لگے اور پھر تو یہ حالت تھی کہ خود بخود اشعار موزوں ہونے لگے اور جب مخالفوں سے مقابلہ ہوا' تو وہ پسپا ہوگئے اور بعد میں وہ اس قدر خائف ہوئے کہ ہمیشہ کیلئے خاموش ہوگئے۔

اس کام سے فارغ ہونے کے بعد مولوی حضور بخشؒ نے اس جذبہ کو تصنیف وتالیف کے اصلاحی کام پر لگادیا چنانچہ ان کی تصانیف میں اکثریت منظوم تراجم کی ہے' ایک قادرالکلام شاعر کی حیثیت سے انہوں نے بعض دینی کتب کا بلوچی میں منظوم ترجمہ کیا ہے' اور سچ تو یہ ہے کہ موصوف نے ترجمہ کا حق ادا کیا ہے' بلوچی زبان میں دینی کُتب کی بہت کمی تھی' جسے مولوی موصوف کی کتب نے پُورا کردیا۔

آخر میں یہاں مولوی حضور بخشؒ کی اُن کُتب کی فہرست دی جاتی ہے جو آج بھی نہایت ہی دلچسپی اور شوق سے پڑھی جاتی ہیں' مولوی موصوف نے شروع میں مشہور درسی کتاب قدوری کا عربی سے بلوچی میں ترجمہ کیا' شمائل شریف جو عربی میں ہے' اس کا بلوچی میں منظوم ترجمہ کیا' اسی طرح ''خلاصہ کیدانی'' منیۃ المصلّی' روضۃ الاحباب' اور حکایت الصادقین' جو عربی زبان کی مستند درسی کتب ہیں' مولوی موصوف نے انہیں بلوچی میں ترجمہ کیا' حکایات عجیبہ' خاکساری فریب ہدایت ابدی اور اصول الصلواۃ مولوی حضورت بخشؒ کی منظوم تصانیف میں سے ہیں۔

مولوی حضور بخشؒ کی شاعری خالص دینی مذہبی شاعری ہے انہوں نے جو کچھ کہا وہ دینی اُمور یا الہیات سے متعلق ہے' ایک قادر الکلام شاعر کی حیثیت سے ان کی شاعری میں روانی اور خلوص ہے' اس لئے بلوچ عوام میں اسے مقبولیت حاصل ہے۔

نمونہ کلام...... مولوی حضور بخشؒ

اللہ گت' اَمَر پیغمبرا ارا
کہ ہَر حدپلی گش ہر مَشر کارا
مَرچی مُلک حاکم کُل قرارَنت
پذری منکران لجت ندارَنت
کفاروسی رَواجان گس' اوارَنت
مگر اَج دین اسلاما فِرارَنت
رواج وَس کہ زُر نغتشن کفاری
گتیش ہم دوزَخی طرفا تیاری
پد اَج مرغی کہ انکیش پَر قیامت
بیت نُورِن بَنی دِماخجالت
حضور بخشؒ مصنف اِکتابی
چہ ترَغ نین خیالی ہرجابی
یہ حق کشغ مَناہ اج منکریا
سغر ہم اِرنی دستی تریا
استِ وَت قوم گن' زانا جتی
طاقت قدر انخت گشغا چہ کشتی

○

ترجمہ:

خداتعالی نے نبی کریم ﷺ کو حکم دیا تھا کہ
مُشرک جہاں بھی ملیں انہیں قتل کرو، مگر آج
کل کے مسلمان حاکم خاموش ہیں، اور
منکرین سے میل ملاپ میں مصروف! بلکہ
آج تو خود مسلمانوں نے دین اسلام سے فرار
کی راہ اختیار کی ہے!
اور انہوں نے کفار کے طور وطریق اپنا لئے
ہیں، اس طرح مسلمانوں نے بھی اپنے واسطے
دوزخ کا سامان تیار کرلیا ہے!
بالآخر وہ حضور ﷺ کے سامنے قیامت کے
روز خجل ہونگے۔
اس کتاب کا مصنف حضور بخش ہر خوف اور
حجاب سے بالاتر رہ کر صحیح باتیں بیان کرتا
ہے۔
اور اس کے لئے وہ سر ہتھیلی پر رکھ کر سب کچھ
گزرنے کے لئے تیار ہے، تاکہ اُسے خُدا
اور رسول ﷺ کی رضا حاصل ہو،
اور وہ جنت کی زندگی سے نوازا جائے!

ooo

بلوچوں کا ایک گمنام شاعر

سُہنا بخش علیؒ

بلوچی ادب کے ملک الشعراء جام دُرک کے بعد انیسویں صدی عیسوی کے بلوچ الشعرائے کرام میں سے سہنا بخش علیؒ ہی ایک ایسا شاعر تھا' جس نے رومانی شاعری کو زندہ رکھا' چونکہ بلوچی زبان کا شعری ادب زیادہ تر کلاسیکی شاعری اور لوک گیتوں پر مشتمل ہے۔ اس لئے اس زبان میں صرف رومانی اور عشقیہ اشعار کہنے والے شعراء بہت کم گزرے ہیں اور جو تھے وہ بھی گمنامی کی حالت میں رہے۔ عشقیہ کلام کے موجد ملک الشعراء جام دُرک ڈومبکی کے بعد سہنا بخش علی نے اس فن میں کامیابی حاصل کی ہے' لیکن اس دور میں اس صنف شاعری کے مقبول نہ ہونے کی وجہ سے وہ بھی گمنام رہا۔ اس لئے اس کا کلام ناپید ہے' مسٹر ڈیمز نے سُہنا بخش علی کے چند اشعار کا انگریزی میں ترجمہ کیا ہے' اور آج یہی مختصر سرمایہ اس کی ادبی یادگار کے طور پر باقی ہے یا پھر وہ طویل نظم جو اس نے جمالو سے ملاقات کے سلسلے میں کہی ہے' یہ نظم علاقہ لہڑی کے ایک معمر بلوچ وڈیرہ خیر بخش خان براہمانی کو ازبر ہے اور یہاں اسے آخر میں نمونے کے طور پر پیش کیا جا رہا ہے۔

سُہنا بخش علی کے سوانح حیات سے متعلق ایک روایت کے مطابق 1811ء میں وہ قصبہ سُہران میں پیدا ہوا۔ اس کا والد بشک علی ایک معمولی زمیندار تھا' جو بلوچوں کے

ل سُہنا بخش علی ایک نام نہیں' سُہنا الگ نام ہے اور بخش علی الگ' بشک علی (بخشعلی) خوش گو شاعر تھا' سُہنا اس کا لڑکا تھا جس نے شاعری کا فن میراث میں پایا اور خوب اکتساب فیض کیا۔ مصنف

مشہور قبیلہ رند کے سُہرانی خاندان سے تعلق رکھتا تھا۔ سُہنا بخش علی نے اپنے خاندانی حالات کے مطابق کچھ فارسی اور عربی کی تعلیم بھی حاصل کی' چونکہ زمینداری کا پیشہ تھا' اس لئے حصولِ روزگار کے لئے کسی طرح کی تگ ودو نہ کرنی پڑی' باپ کی نسبت سے سُہنا بخش علی کے نام سے مشہور تھا۔

ایک مشہور مقولہ ہے کہ شاعر پیدا ہوتا ہے بنتا نہیں' لیکن شاید سُہنا بخش علی پر مقولہ کا اطلاق نہیں ہوا' اس کے متعلق روایت ہے کہ ایک دن اپنے مویشی چراتے ہوئے بی کی مشہور ندی ناڑی کے ایک نشیب میں پہنچا' جہاں پانی کا کافی ذخیرہ تھا' مویشی پانی پینے لگے یہ جب گھاٹی سے اُتر کر پانی کے ذخیرہ کے قریب پہنچا تو وہاں دو عورتوں کو دیکھا' جمالو اپنی کنیز کے ساتھ کھڑی ہوئی بالوں کو سکھا رہی تھی' سُہنا بخش علی اسے دیر تک دیکھتا رہا' جمالو نے بھی اسے دیکھ لیا۔ سُہنا بخش علی نے اظہار محبت کے طور پر چند الفاظ کہے' جمالو نے اسے کہا کہ اگر واقعی میرے عاشق ہو' تو آٹھویں روز سفید پوشاک پہن کر گھوڑے پر یہاں آنا پھر ملاقات ہوگی' کہتے ہیں کہ اس ملاقات میں کچھ رنجش ہوگئی۔ جس کی وجہ سے سُہنا بخش علی وہاں ٹھہر نہ سکا' جمالو نے اسے منانے کی بہت کوشش کی مگر غصے میں اس نے جمالو کو ٹھکرا دیا' جب اسے اپنی غلطی کا احساس ہوا جمالو کو اپنانے کے لئے بہت بھاگ دوڑ کی لیکن اسے ناکام لوٹنا پڑا اور ناکام ہونے کی وجہ سے اس نے سب کچھ چھوڑ دیا گھر بار چھوڑنے کے بعد وہ تارک الدُنیا درویش بن گیا اور پھر کچھی کے ''دشتِ بے دار'' میں دشت پیمائی کرتے ہوئے عمر کا ایک حصہ گزار دیا۔

محبت کے متعلق سُہنا بخش علی کا نظریہ آفاقی ہے اس لئے وہ تمام عمر عشق ومحبت کے نشے میں مخمور رہا جب کبرسنی نے مجبور کیا تو وطن کو لوٹ آیا اور گوشہ نشین ہوگیا اب زبان سے شعر کی صورت میں جو کچھ نکلتا وہ محبت اور صرف محبت ہی کی شان میں ہوتا' زبان اس کی صاف شیرین بلوچی ہے مگر کہیں کہیں اپنے کلام میں اس نے عربی اور فارسی

کے محاورے اور تشبیہیں استعمال کی ہیں، جس سے اس کے کلام میں ایک قسم کی لطافت اور نزاکت پائی جاتی ہے:
اس کا پہلا شعر[1]، جو جمالو کی تعریف میں ہے،
ثنائے الٰہی کے ساتھ اس طرح شروع ہوتا ہے

> آج مجھ پر اللہ تعالیٰ کی رحمت ہوئی، یہ رحمت اس طرح برس رہی ہے، جس طرح صدف پر ابرِ نیساں برسے میری نگاہوں کے سامنے وہ حسین وہ حور شمائل جمالو خاموش کھڑی ہے، اس کے سر پر سلطان شاہ پور کا ہیروں سے دمکتا ہوا تاج ہے، کیا ارض وسماء ایسی حسین اور بہترین تصویر پیش کر سکتے ہیں، سرو شمشاد کو طاقت ہے کہ وہ اس کے حسین قد کی ہمسری کر سکیں؟!

ایک کامیاب مصور کی طرح وہ اپنی محبوبہ کے سراپا کو کچھ اس طرح پیش کرتا ہے کہ اس کا تمام حسن آنکھوں کو ایک حسین و دلفریب منظر کی طرح دکھائی دیتا ہے، اس قطعہ میں اپنی محبوبہ کو نیند کی حالت میں پیش کرتے ہوئے اس کے حسن خوابیدہ کی تعریف کرتا ہے:

> ”پری پیکر جمالو نیند میں تھی، اس کی خوبصورت عنبریں زلفیں اس کے حسین شانوں پر پریشان تھیں اور اس کا جنتی چہرہ چمک رہا تھا۔ میں ضعف کی وجہ سے اس کے خوبصورت بالوں اور اس کے حسین چہرے کی تعریف کرنے سے قاصر ہوں جو خوابیدہ ہونے کے باعث بے حد حسین و پیارا دکھائی دیتا ہے“۔

[1] شعر کا لفظ بلوچی میں نظم کے لیے بھی مستعمل ہے۔

مشرق کے قدیم شعراء اکثر اپنے محبوب کے خدوخال کو مختلف تشبیہوں اور استعاروں میں پیش کرتے رہتے ہیں، سُہنا نے بھی اپنی خانہ بدوش محبوبہ کے خدوخال کو اپنے اکثر اشعار میں اسی طرح پیش کرنے کی کوشش کی ہے، ایسا ہی ایک شعر یہ بھی ہے:

تیرے غمزے تیر ہیں اورابرو شمشیر
اور تیری نازک ناک تیز خنجر کی مانند ہے

محبوبہ کے عشق میں سرشار شاعر اس کے حُسن سراپا کی تعریف کے بعد اس کی مسکراہٹ اور دانتوں کو بھی حسین وجمیل قرار دیتے ہوئے یوں تعریف کرتا ہے:

اس کے دو لعل جیسے لبوں کے درمیان خوبصورت
دانت مروارید کی دو لڑیوں کے مانند ہیں اور اس
شوخ کی مسکراہٹ تو اپنا جواب نہیں رکھتی،
اس کی دلکش آواز جب خوش گلو شیرین زبان سے
نکلتی ہے تو طوطی کی مجال نہیں کہ اپنی میٹھی اور سُریلی
آواز کا دعویٰ کر سکے۔

عشق مجازی کے بعد عشق حقیقی کی منزل ہے، خانہ بدوش جمالو کا شیدائی جب اپنی اس حسین وجمیل محبوبہ کو حاصل نہ کر سکا تو اس نے اپنے مجازی عشق کو عشق حقیقی میں بدل دیا، اور پھر اس کے بعد وہ اکثر جمالو کے حسن وجمال کی تعریف کے ساتھ ساتھ عشق حقیقی کی صداقت کو سراہتے ہوئے اسے اپنا مطمع نظر قرار دیتا ہے۔

''اس میں شک نہیں کہ جمالو کے حسن وجمال کی تعریف نہیں ہو سکتی، اسے صرف بے حد حسین کہنا ہی کافی نہیں لیکن جس نے اسے بنایا ہے، وہ برگزیدہ ہستی اس سے زیادہ حسین وجمیل اور لائق صبر تعریف ہے''۔

میں اس کے بے پایاں حُسن کی تعریف کرنے سے قاصر ہوں، اگر میری محبوبہ

حسن وجمال میں اپنا نظیر نہیں رکھتی تو اسے بنانے والا اس سے کہیں زیادہ لاثانی اور لافانی حسن اور بہترین خوبیوں کا مالک ہے' اب اس کا عشق ہی میری زندگی کا مدعا ہے۔

اسی طرح وہ زندگی کے متعلق بھی عشق ومحبت کا نظریہ رکھتا ہے' وہ محبت ہی کو اپنا مقصدِ حیات قرار دیتا ہے' اور محبت ہی اس کا سرمایہ حیات ہے۔

محبت پھر محبت ہے چاہے وہ جلتی ہوئی آگ ہی کیوں نہ ہو' عشق ومحبت کی زندگی ہی دراصل سچی زندگی ہے' خداتعالیٰ مجھے یہی زندگی نصیب کرے!!

عشق ومحبت کے پاکیزہ جذبات کی ترجمانی کرنے والا عظیم شاعر سُہنا بخش علی گمنامی کی زندگی بسر کر گیا۔ آج اس کا کوئی دیوان بطور یادگار موجود نہیں' لیکن اس کے چند منتشر اشعار اس بات کی صداقت کو پیش کرتے ہیں کہ گو وہ زندگی میں گمنام رہا اور گمنامی کی موت مرا لیکن ہمارے لئے وہ اپنے جذبہ عشق اور اپنی انفرادیت کے باعث آج بھی زندہ ہے۔

نمونہ کلام......سُہنا بخش علی

سُہنا بخش علی کی یہ طویل نظم میر خیر بخش براہمانی سے حاصل ہوئی ہے' جو جمالو سے پہلی ملاقات کے موقعہ پر کہی گئی:

مروشین دوزمان واہانی و ھماکیں
گشے گراں قیمتیں لعلِ بدشکاں!
پہ عرضِ نرخ کہ لکھیں فلوشکاں
خریداراں مناں جوہر فروشاں
زباذ تُھتی عطر ءُ دلیلاں
جتّی صیقل من تیلاں ءُ پُھلیلاں
نظر کھیۓ راشیں زرین کماچاں
کھشی قدم قامہ شمشاد قربان

نجل بیثھ قدمؔ ءِ سرؤ بوستان
گل ءِ لعلاں و گلزار ءِ گلستان
گہیں پھر ناز ءِ عالی حکمت ءِ شان
رغادل گھتہ عجب شمارے وزم مثال
گھتی چندی چکوراں سر فروشان
سرے آہیں کہ بازیں اشک ءِ حاکاں
فراقاں بیمار آہو در فراقاں
نگوش کہ ءِ یہ تفاکے من تھر اشاں
بخیلے حاکماں کھس نہ گشئی جوان
امیدوار کہناں پیشاں غریباںؑ
کھن وسرگذ اپڑدوے ٹھل گراں
گہیں کھساں راجی تاجداراں
نہ چھرے تھیش وتی حرف ءِ ہزاراں
کمنداں گراں چھونگین باراں
نجسکاں بازیں گرند ہوھاران
نقاباں اے جبیں ءِ حاجت ءِ زید
وڈیں کھوہے ساتھ ءِ دل پہ جانی
رسائیں داں میزل ءِ میرومانی
کہ ہمودا داب تھڑمیں راہزنانیؑ

o

ترجمہ:۔

آج میں نے اپنے دوست کو خواب میں دیکھا' آپ کہیں
گے کہ وہ ایک بے بہا موتی ہے' میں یہ عرض کروں گا کہ
اس کی قیمت لاکھوں سے زیادہ ہے'
اس کا خریدار میری ہی طرح کوئی جوہری ہو سکتا ہے!
میرے دوست کے جسم کی خوشبو عطریات سے زیادہ ہے
اس نے اپنی مانگ میں سندور بھرا ہوا ہے'
ان سنہرے زیورات کی وجہ سے کہیں اُسے نظر نہ لگے!
خُدا تعالیٰ نے اس کے قد وقامت کو اس قدر خوبصورت بنایا
ہے کہ شمشاد بھی اس پر قربان ہے' اور باغ کا
سرد (درخت) بھی اس کے قدموں پر جُھکا ہوا ہے'
گلِ لالہ' گلستان اور سبزہ زاروں میں میرے دوست پر
نچھاور ہوتے ہیں'
وہ اپنی عالی حکمت اور شان وشوکت کی وجہ سے بہت ہی
اچھا ہے'
اس کے خوبصورت چہرہ نے میرے دل پر عجیب اثر کیا ہے'
اس پر چکوروں اور دیگر خوبصورت پرندوں کی خوبصورتی
بھی قربان ہے!
بخیل حاکموں کو کوئی بھی اچھا نہیں کہتا وہ پہلے تو غریبوں کو
امید دلاتے ہیں پھر بعد میں اپنے اوپر ایک بڑا پردہ ڈال
دیتے ہیں'

اچھے آدمی جو کہ قوموں کے سرتاج ہوتے ہیں اپنی زبان
سے نکلے ہوئے ہر لفظ پر پوری طرح پابند رہتے ہیں'
وہ بہادروں کی طرح کمندیں ڈالتے ہیں'
وہ بادل کی گرج اور بارش کے زور میں بھی جنبش نہیں
کرتے' ڈٹے رہتے ہیں!
اے دوست اب ضرورت اس بات کی ہے کہ اپنے رخ
سے پردہ اٹھادو!
اور میرے دل کا ساتھ دیکر میرے ساتھ رہو!
اور جلدی سے اس (دل) کو منزل تک بخیریت پہنچادو'
کیونکہ یہاں ڈاکو اور راہزنوں کا ہمیشہ خطرہ رہتا ہے!!

ooo

محمد خان مری

محمد خان مری اپنے دور کا ایک بہادر سپاہی اور سُلجھا ہوا شاعر تھا' وہ علاقہ مری کے مشہور قصبہ کاہان میں 1850ء میں پیدا ہوا' اور 82 سال زندہ رہنے کے بعد 1932ء میں فوت ہُوا' اس کے والد وزیر خان مری' مری قبائل کے سردار خیل خاندان بہاول انزئی کے اعلیٰ فرد تھے اور اس کی والدہ محترمہ' خیر محمد کھیازئی بگٹی کی دختر تھیں' وہ باہمت خاتون تھیں' محمد خان نے ایسی باہمت خاتون کی آغوشِ شفقت وشجاعت میں پرورش پائی اور بڑا ہوکر مری بلوچوں کا نامور سپُوت بنا۔

ابتدائی تعلیم اس وقت کے دستور کے مطابق ایک چھوٹے دینی مدرسہ میں حاصل کی قرآن مجید ختم کیا' اور کچھ فارسی کتب بھی پڑھیں' محمد خان کو انگریزی سے نفرت تھی اور یہ نفرت اسے ورثہ میں ملی تھی کیونکہ جب اس نے ہوش سنبھالا تو انگریزوں کے اقتدار کا دور دورہ تھا۔ یہ 1879ء کا ذکر ہے۔ خان محراب خان والئی قلات انگریزوں کے ہاتھوں شہید ہوگئے تھے' جس کی وجہ سے انگریزوں کے خلاف بلوچی قبائل میں نفرت کی آگ پھیل گئی۔ اس لئے جابجا مری قبائل نے عملی طور پر انگریزی فارورڈ پالیسی کو ناکام بنانے کی کوششیں شروع کیں جس کے جواب میں انگریزوں نے انہیں سرکرنے کے لئے ایک لشکرِ جوار کاہان کو فتح کرنے کیلئے بھیجا جو اس وقت مریوں کا گڑھ تھا۔ اس دور کے سردار دوداخان نے اپنے لڑکے دین محمد اور ایک مقدم ھیبت خان لوہارانی کی سرکردگی میں ایک لشکر انگریزی سپاہ سے مقابلہ کے لئے بھیجا' جس نے نفسک کے مقام پر

مقابلہ کیا، نتیجہ کے طور پر بہت سے انگریزی سپاہی مارے گئے، جس میں میجر گلبرٹ بھی تھا، پھر یہ سلسلہ عرصے تک جاری رہا، انگریز ہر بار حملہ آور ہوتے لیکن پسپا ہوتے۔ بالآخر فیصلہ کن لڑائی کا وقت آ گیا، محمد خان نے اس لڑائی میں ایک دستے کے سالار کی حیثیت سے اہم فریضہ ادا کیا، 1918ء میں انگریزوں نے مری قبائل کے سردار خیر بخش خان مری سے ٹکر لی۔ جس کے جواب میں قبائل اور انگریزوں میں جنگ چھڑ گئی، محمد خان کو ایک ایسے دستے کی کمان دی گئی جس نے سبّی سے آنے والی انگریزی سپاہ سے نبرد آزما ہونا تھا، لیکن اس عرصے میں انگریزی سپاہ نے پہاڑی راستوں سے پہنچ کر گمبد پر چھاپ کر حملہ کر دیا، یہاں مری قبائل کو شکست ہوئی۔ ابھی وہ گمبد کی طرف آ رہا تھا کہ اطلاع ملی کہ انگریزی فوج براستہ کوہلو ہڑپ پہنچنے والی ہے، وہ ہڑب کے قریب پہنچا تو اسے بتایا گیا کہ انگریزی سپاہ کو یہاں بھی کامیابی ہوئی ہے۔ مرّی قبائل کے نامور جرنیل اور کماندار اعلیٰ میر خدائیداد خان بجارانی اور دیگر سینکڑوں معتبرین مری اس جنگ میں شہید ہوئے۔ انگریزوں سے اس بڑی شکست کے بعد مری قبائل پہاڑوں میں پھیل گئے اور انتقامی حملے کرتے رہے، محمد خان کا مقابلہ انگریزی سپاہ سے کوچالی کے مقام پر ہوا، یہاں اس نے انگریزی فوج کو شکست فاش دی، یہاں اسے اطلاع ملی کہ انگریزی سپاہ کاہان پر حملہ آور ہونے والی ہے چنانچہ یہاں سے وہ مختصر سے ساتھیوں کے ساتھ کاہان پہنچا۔ کاہان میں وہ انگریزی فوجوں کے گھیرے میں آ گیا، سخت مقابلہ ہوا، ادھر مری قبائل کی حالت بھی خوراک اور اسلحہ نہ ہونے کی وجہ سے کمزور ہو گئی تھی، لہٰذا انہیں شکست کا سامنا کرنا پڑا، محمد خان بھی لڑتا ہوا گرفتار ہوا، انگریزوں نے مصلحت کے تحت عارضی طور پر یہاں راضی نامہ کر لیا، راضی نامہ کی شرائط میں سے ایک شرط میں جنگی سرغنوں کو انگریزی تحویل میں دینا بھی ضروری قرار دیا گیا، جس کے نتیجے میں پچاس سرکردہ معتبرین مری انگریزوں کے حوالے کیے گئے تاکہ ان پر مقدمہ چلایا جا سکے۔

محمد خان کو بھی ان میں شامل کیا گیا چونکہ سرفہرست اس کا نام تھا' لہٰذا کاہان شہر کے دروازے کے سامنے انگریزی فوجوں کی موجودگی میں سب سے پہلے محمد خان کو ہتھکڑی پہنائی گئی بعد میں شربت خان بجارانی، علی ہان لوہارانی وغیرہ تمام معتبرین کو ہتھکڑیاں پہنائیں گئیں' ان معتبرین مری پر مقدمہ چلایا گیا' قبائلی جرگہ نے محمد خان کو چودہ سال کی قید کا حکم سنادیا' لہٰذا اسے یہ سزا بھگتنے کے لئے پُونا کی جیل میں بھیج دیا گیا' جہاں وہ عرصہ دراز تک قید رہنے کے بعد بالآخر باعزت رہا ہوا اور بقیہ عمر اپنے وطن میں گزار دی۔

محمد خان جہاں خود اچھا شاعر تھا، وہاں وہ شاعروں اور باذوق لوگوں کا سچا قدردان بھی تھا۔ اس کے مجلس خانہ میں اکثر شعروسخن کی مجلس لگتی بلکہ بسا اوقات ایسا بھی ہوا کہ اس نے کسی شاعر کو اپنے ہاں مدعو کیا' رات بھر محفل گرم رہی' صبح اُسے تحفتہً ایک بیش قیمت پگڑی اور ایک اونٹ بخش دیا۔ اس دور کے مشہور شاعر مُلا عمر اور مشکی سے بھی اس کے دوستانہ مراسم تھے' اس کے باذوق دوست اور ہمعصر میر میرو خان ڈومکی بھی اکثر اس کے ہاں مدعو ہوتے' خوب محفل جمتی' ملا عمر' مشکی' اور محمد خان باری باری شعر سناتے اور اہل محفل سے داد پاتے۔

محمد خان' مرثیہ گوئی میں بھی ماہر تھا' یوں تو اُس نے بہت سے مرثیے کہے ہیں' لیکن ایک طویل مرثیہ اپنے لڑکے عمر خان کی وفات پر کہا' یہ مرثیہ سوز وگداز سے پُر اور بہت طویل ہے' اس کے پڑھنے میں تین گھنٹے صرف ہوتے ہیں کہا جاتا ہے کہ مذکورہ مرثیہ اس وقت کاہان کے بیدہ نامی ایک ڈوم کو ازبر ہے جو بہت ہی بُوڑھا ہو چکا ہے' اس کی وفات کے بعد یہ مرثیہ بھی ناپید ہو جائے گا۔

رزمیہ اشعار پر مشتمل محمد خان کی کئی نظمیں موجود ہیں' یہاں جنگ پھیلاوغ سے متعلق اس کی ایک نظم پیش کی جاتی ہے۔

کاہان ءِ دور داریں مری
شیرپچی ءِ سنبھر تغاں
بازیں بہانش بوتغاں
سانڈی کوان اش زرتغاں
ماں درواں برز بیتغاں
پہ شلکیں مُرّیں پھیلاوغ ءِ
پہ دست ءِ ندوئی تیرغاں
پہ شکلانی گیلاں!
کھیڈوں گرانڈی تکڑاں
پھیلاوغ ءِ آن مڑدبراں
کہ ریش وگُلالک سڑاں
ماں قورو کوریں ڈھنگراں
بو ءِ ھلوکانی دیاں
ڈھونڈ ءِ پدا اپتار وراں
گرو گرو بنت پٹت سومری

O

ترجمہ:۔

کاہان کے خوشحال مُری شیر کی طرح
لڑائی کے لئے تیار ہوگئے ہیں
انہوں نے اپنے شاہین صفت گھوڑے
کھول لئے ہیں اور اپنی تلواریں بھی

سونت لی ہیں اور پھر رکابوں پر پاؤں رکھ
کر گھوڑوں پر سوار ہو گئے ہیں، وہ
پورے اشتیاق سے پھیلاوغ کے حصو
ل کیلئے نکل پڑے ہیں!
ہم کسی رشوت یا لالچ میں پھیلاوغ کو
ہاتھ سے نہیں جانے دیں گے!
بلکہ پھیلاوغ کے لئے ہم پہاڑی دُنبے کی
طرح ٹکریں مار کر لڑیں گے۔
پھیلاوغ کو وہ حاصل کر سکتے ہیں جن
کی داڑھیاں اور زلفیں خاک ہو جائیں
یا وہ اپنی قبروں میں گل سڑ کر بدبو دیں یا
ان کی لاشوں کو جنگلی جانور کھا جائیں یا
پھر وہ حاصل کریں جن کی بیویاں اُن
کیلئے ماتم کریں!!

پھیلاوغ کی طرح گُمبند اور کوچاتی کی مشہور جنگ پر بھی اُس نے ایک اچھی نظم کہی ہے جو یہاں پیش کی جاتی ہے۔

سروریں محل ءِ نشتاں ءِ ھلائے
جہاز ہوائی ایں گوستہ گوں تائے
نی مریاں شے لشکر ءِ ڈاھے
جان ءِ سنبھال ءِ سُتّت آں تاہے
بُرنگلیں ریشاں عطراں لائے
دوستاں ژہ موکلائنے بیائے

بہشت باغانی سلیھیں سائے
اغ شہید بی ایت تہ جنتِ ء کائے
گمبند و کوچالی مری پھل آں
جنّت ء باغانی پینگواں جُھلاں

O

ترجمہ:۔

ایک دن مَیں بڑے محل میں بیٹھا ہوا تھا کہ ایک
ہوائی جہاز بڑی تیزی سے گزرا مَیں نے کہا اے
مریو! اپنے لشکر کو تیار کرواور شہادت کی تمنا کرو، اپنی
خوبصورت داڑھیوں کو خوشبو لگاؤ اور اپنے عزیز
اوردوستوں سے اجازت لے کرآ جاؤ۔
بہشت کے باغات قابل دید ہیں' اگرتم شہید ہو جاؤ
توتمہیں جنت ملے گی۔
گمبند اورکوچالی کی جنگ میں شہید ہوجانے والے
مری جنّت کے پھول ہیں' وہ جنت کے باغوں میں
جھولا جھولیں گے!

محمد خان کی شخصیت بڑی عجیب وغریب سی تھی' وہ امن کے دنوں میں انصاف پسند' لڑائی کے موقع پر بہادر سپاہی اور خوشی کے وقت طنز ومزاح کا دلدادہ' دن کو وہ اپنے قبیلہ کے لوگوں کے مقدموں کے فیصلے کرتا' اور رات کو اس کا محفل خانہ باذوق لوگوں سے بھرا رہتا' شعروشاعری کی محفل جمتی' اور طنز ومزاح کا دور شروع ہوتا یہاں تک کہ رات نصف سے زیادہ گزر جاتی۔

OOO

قاضی نور محمد گنج آبوی

جیّد عالم، بے باک مورخ، قادر الکلام شاعر

بلوچوں نے جہاں میدانِ کارزار کے بہت سے معرکے سر کئے وہاں انہوں نے علم وادب میں بھی اپنا ایک مقام پیدا کیا بلکہ ان میں سے بعض تو صاحبِ سیف وقلم بھی تھے، چنانچہ بلوچی زبان کا ملک الشعراء جام دُرک جہاں دربار قلات کا عظیم شاعر تھا، وہاں وہ بہترین سپہ سالار بھی تھا اور اس سلسلے میں وہ علاقے کچھی میں ایک جگہ کماندار کی حیثیت سے بیرونی حملہ آوروں کا مقابلہ کرتے ہوئے شہید ہوا، چاکرِ اعظمؒ کے دور کا عظیم شاعر "بیرگ" بھی شوران کی مشہور جنگ میں مارا گیا، رحم علی مری اور قاضی نور محمد گنج آبوی، میدانِ کارزار کے سپاہی بھی تھے اور اپنے دور کے عظیم دانشور اور شاعر بھی، بلکہ بلوچی زبان کے بعض قدیم شعراء نے بلوچی کے علاوہ سندھی اور فارسی میں بھی شاعری کی ہے، چنانچہ ناطق مکرانی، زیب مگسی، مرزا احمد علی، فقیر محمد پہلوان اور قاضی نور محمد قابل ذکر ہیں، قاضی موصوف نے بلوچی زبان میں شاعری نہیں کی، لیکن جنگنامہ میں انہوں نے جو کچھ پیش کیا ہے، وہ بلوچی تہذیب وثقافت اور بلوچوں کے بہادرانہ کارناموں کی ایک پوری داستان ہے جسے اب تاریخی حیثیت ہوگئی ہے، جنگ نامہ کے خالق کو اسی لئے یہاں پیش کیا جارہا ہے کہ وہ بلوچوں کا شاعر اور مورخ ہے۔

خان نصیر خان اوّل والئ قلات کا دور جو بلوچ تاریخ میں ایک زریں دور شمار کیا جاتا ہے' قاضی نور محمد گنج آبوئی اس دور کے بلند پایہ عالم بے باک مورخ اور قادر الکلام شاعر تھے' آج بھی ان کے کتب خانہ میں ان کے اپنے قلمی مسودے موجود ہیں' یہ کتب خانہ گنداوا' گنج آبوی میں مرحوم کی آبائی رہائش گاہ کے ایک کمرہ میں واقع ہے اور اسے ان کے ورثاء نے محفوظ کر دیا ہے۔

قدیم تاریخی کتب میں لکھا ہے کہ قاضی نور محمدؒ کے جد امجد غازی محمد بن قاسم کے ساتھ شوق جہاد کے سلسلے میں شیراز سے مکران آئے تھے' مکران کی فتح کے بعد محمد بن قاسم نے پنجگور کے قریب ہی ایک زرخیز دشاداب علاقہ جاگیر کے طور پر انہیں عطا کیا' جہاد سے فراغت کے بعد ان کے خاندان کے کچھ افراد نے درس وتدریس کا سلسلہ شروع کیا اور چند افراد تجارت پیشہ بن گئے جن کی تجارت کا مرکز قلات تھا' کیونکہ اس زمانے میں قلات براعظم ایشیاء کی بڑی تجارتی منڈیوں میں سے ایک تھا۔ چنانچہ کچھ عرصہ بعد موصوف کے خاندان کے اکثر افراد قلات میں رہنے لگے اور پھر مستقل طور پر یہیں پر رہائش اختیار کر لی' تجارت تو ایک معاشی ذریعہ تھا' دراصل ان کے پیش نظر علم وادب کی ترویج تھی' لہٰذا قاضی نور محمد کے جدّ امجد۔ قاضی محمد داؤدؒ سلطان محمود خان حاکم بکھر کی دعوت پر درّہ بولان کے راستے ''سیوی'' پہنچے۔ جہاں انہیں قاضی بکھر کا عہدہ پیش کیا گیا' بعد میں انہیں علم وادب کی خدمت کے صلہ میں ''گنج آبہ'' کے نواح میں جو نظامت کچھی کا زرخیز ترین علاقہ ہے بہت سا قطعہ اراضی بطور جاگیر مرحمت ہوا اور انہوں نے بعد میں گنج آبہ کو جسے اب ''گنداوا'' کہتے ہیں اپنا مسکن بنایا اور یہیں قاضی نور محمد پیدا ہوئے۔

۱۔ غالباً یہ بزرگ قاضی نور محمد کے دادا تھے' مصنف۔

قاضی نور محمدؒ کے جدِ گرامی حضرت قاضی محمد داؤدؒ کے متعلق ''تاریخ معصومی'' میں ایک جگہ لکھا ہے: ''حضرت قاضی داؤدؒ فتح پور جو گنداواہ کے قریب ایک تاریخی مقام ہے کے رہنے والے تھے جو سیوی کے نواح میں ہے' سلطان محمود خان حاکم بکھر کے اوائل حکومت میں انہوں نے شہر بکھر کے قضا کا منصب قبول کیا تھا' اور شرعی مقدمات فیصل کیا کرتے تھے' فی الواقع یہ بزرگ اپنے عہد میں یگانہ تھے' اور انتہائی دینداری' امانت' پرہیز گاری اور درویشانہ صفات کے حامل تھے' اور شریعت اور تقویٰ کے سخت پابند تھے' ماہِ شوال 981ھ میں بکھر کے میدان میں ان کی دستاویزِ حیات پر موت کی مُہر ثبت ہوئی''۔

یہاں اس بات کو پیش کرنے کا مقصد قاضی نور محمد گنج آبوی کی علمی وادبی حیثیت کو ثابت کرنا ہے جو انہیں اپنے جدِ گرامی سے ورثہ میں ملی اور انہوں نے اپنے بزرگوار کی طرح دنیائے علم وادب میں اپنا مقام پیدا کیا چنانچہ خان نصیر خان اعظم اول ان کے علم وادب کا بہت ہی مداح تھا اور اس لئے اکثر انہیں اپنے ساتھ رکھتا تھا' یہاں تک کہ اس نے بعض اہم معرکوں میں بھی صلاح ومشورے کے لئے انہیں اپنے ساتھ رکھا' ان میں پنجاب کا عظیم معرکہ بھی ہے اس میں خان نصیر خان اولؒ احمد شاہ ابدالیؒ کے ساتھ سکھوں سے ایک لڑائی میں شریک تھا' چنانچہ قاضی نور محمد گنج آبوی کی منظوم فارسی تصنیف ''جنگ نامہ'' میں اس کا تفصیل سے ذکر ہے' یہ کتاب اس دور کے جنگی کارناموں کی ایک سچی تاریخ ہے' ایک غیر جانبدار مورخ اور قادر الکلام شاعر کی حیثیت سے انہوں نے اس میں اپنے دور کے جنگی واقعات بلاکم وکاست بیان کئے ہیں'' جنگ نامہ'' کو بلوچستان کی قدیم تاریخی کتابوں میں ایک اہم مقام حاصل ہے۔

پانی پت کی تیسری لڑائی 1761ء کے بعد جب مرہٹوں کی طاقت ختم ہوگئی تو اس کے چند برس بعد پنجاب کے سکھوں نے طاقت حاصل کرلی اور تمام پنجاب میں شورش شروع کردی یہاں تک کہ ہندوستان کے مسلمان بھی ان کے مظالم سے تنگ آگئے مسلمانانِ ہند کی اس حالت کو دیکھ کر حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی نے احمد شاہ ابدالی اور میر نصیر

خان اعظم کو سکھوں کے خلاف جہاد کیلئے دعوت دی۔ احمد شاہ ابدالی جو پہلے ہی تیار بیٹھا تھا' اس نے میر نصیر خان کو اپنے ارادہ سے آگاہ کیا' اور بلوچی لشکر کی جمع آوری کا پیغام بھی بھیجا' بالآخر مختصر عرصے میں افغانوں اور بلوچوں کا ایک متحدہ لشکر پنجاب کی سرحدوں کے قریب پہنچ گیا۔ قاضی نور محمد گنج آبوی اس حملے میں نصیر خانِ اعظم کے ساتھ تھا وہ ایک مورّخ کی حیثیت سے جنگ کا پورا نقشہ کھینچتے ہوئے خانِ اعظمؒ کا ایک اہم واقعہ بھی بیان کرتے ہیں' جو دوران جنگ انہیں پیش آیا' اس سے نصیر خانِ اعظم کی دینداری اور اسلام دوستی کا پتہ چلتا ہے' موصوف اپنی تصنیف ''جنگ نامہ''[1] میں ایک جگہ اس لڑائی کا اس طرح نقشہ کھینچتے ہیں۔

''لاہور کے قریب سکھوں نے مجاہدین کا مقابلہ کیا' احمد شاہ ابدالی نے فوج کے دو حصے کر دیئے اور میر نصیر خان اعظمؒ کو ہراول دستے کی کمان سنبھالنے کا حکم دیا' مجاہدین کی بے چین تلواریں اُٹھیں اور سکھوں پر بجلی کی طرح گریں' لاہور کی اس جنگ میں بلوچوں نے خُوب جوہر دکھائے' کئی بلوچ سردار میدانِ جنگ میں کام آئے اور انہوں نے جام شہادت نوش کیا۔

میر نصیر خانِ اعظمؒ بذاتِ خود میدانِ جنگ میں داد شجاعت دے رہا تھا..... دورانِ جنگ ایک اہم سبق آموز واقعہ بھی پیش آیا' ایک بہادر سکھ نے عقب سے میر نصیر خانِ اعظمؒ پر نیزہ کا ایک بھر پور وار کیا' خان موصوف لڑکھڑا کر گھوڑے کی پُشت پر سے گر پڑا' گرتے ہی اس کے لمبے بلوچی بال جو کہ چھاتی پر لہرا رہے تھے بکھر گئے یہی سکھ سپاہی دُوسرا وار بھی کرنے ہی کو تھا کہ اس کے ایک ساتھی نے بلند آواز سے کہا ''اسے مت مارو یہ ہم میں سے ہے'' چنانچہ میر نصیر خانِ اعظم بچ گیا لیکن غشی کے عالم میں اس آواز کو سن چکا تھا' جنگ کے اختتام پر اس نے سر کے لمبے بلوچی بالوں کو کٹوا دیا اور افسوس کرتے ہوئے کہنے لگا کہ ان کی وجہ سے مَیں شہادتِ اعظمیٰ کے مرتبہ سے محروم رہا''۔

۱۔ جنگ نامہ منظوم ہے اور فارسی میں ہے' یہاں متعلقہ واقعہ کو اُردو میں اختصار سے پیش کیا گیا ہے' مصنف۔

نتیجتاً اس جنگ میں سکھوں کو شکست فاش نصیب ہوئی مجاہدین نے مسلمانانِ ہند کو زندہ کفار سے بچالیا' احمد شاہی لشکر فتح کے شادیانے بجاتا اپنے وطن لوٹا اور نصیر خانِ اعظم بلوچ مجاہدین کے ساتھ منٹگمری اور ملتان کے راستے بلوچستان واپس ہوا۔

قاضی نور محمد نے "جنگنامہ" میں بلوچوں کی اسلام سے وابستگی اور اس کے لئے ایثار و قربانی کی جابجا نشان دہی کی ہے' اور ساتھ ہی بلوچ فوجوں کی شجاعت اور دلیری کے واقعات بھی بیان کئے ہیں' چنانچہ جنگ نامہ میں ایک جگہ انہوں نے بلوچوں کی سکھوں سے لڑائی کے ایک واقعے کو نمایاں طور پر اس طرح پیش کیا ہے:

بضربِ سنان و بہ تیغ و تفنگ
یکے ازو گر بیش لیکرو جنگ
سکان بار ہا بر سر شیر ہا
زوندی بمیدان چو تند اژدھا
بلوچاں غازی فشردند پا
زفتند چون کوہ آہن زجا
چناں نیزوندی سکان زاز تیغ
کہ یک جانِ خود رانکروہ دریغ
چو دیدند سکہا کہ شیران دین
بخنداز جائی خود چون زمین
ہمہ پشت دارند بروئی بشان
برفتند افتان وخیزان روانشان
ہمہ جہلبانان زخورد وکلان

بلوچانِ کچھی چو شیر ژیان
بفرمودہ خان دران جایگاہ
بماندند برحسب فرمان شاہ
چو سدِ سکندر در آن جائے خویش
بماندند ہرگز نرفتند پیش
دگر سروران زہم رئیسانیان
کہ بہر غزا سخت بستہ میان
برفتند ہمراہا خان یک بیک
کہ تازند برکافر زشت رک

اور جب وسیع پیمانے پر مقابلہ ہوتا ہے تو یہاں خان نصیر خانؒ خان قلات بھی احمد شاہ ابدالیؒ کے پابہ رکاب ہے قاضی موصوف کے جذبہ جہاد کو یہاں بڑی خوش اسلوبی سے پیش کیا گیا ہے:

شیشہ براں بحر پیما نہنگ
برآمد رواں شد بمیدان جنگ
بمیدان جنگ آنچناں خوش دوید
کہ گوئی بیک مرغزارے رسید
بفرمودتا نامدارانِ دین
ہمہ ہمگیروہہ برآید بزین
بفرمان آن شاہِ گیتی ستان
محمد افواج لشکر روان دوان
وزیر اعظم شیر دل پیل زور

بخصم افگنی ہچو بہرام گور
برآمد براسب دروان شد چو باد
روان شدپس شاہ فرخ نہاد
برآمد برین خانِ عادل بلوچ
روان شد بمیدان ہیجا بنوج
بلوچان ہماں ہچو شیرِ غرین
بمقصد جاں جنگ دین جنگ دین

قاضی نور محمد گنج آبوی اپنے دور کے بلند پایہ شاعر مورخ اور محقق تھے۔ انہوں نے چند ایک مثنویاں تصنیف کی ہیں شاید کچھ اور مسودے بھی ہوں، جو ان قلمی مثنویوں کی طرح اب تک غیر مطبوعہ حالت میں کسی گوشہ میں پڑے ہوئے ہوں' تاہم قاضی موصوف نے علم وادب کے ذریعے بلوچوں کی خدمت کی ہے' انہیں دنیا میں متعارف کرانے کی کوشش کی ہے اور جنگ نامہ اس کا زندہ ثبوت ہے' ہوسکتا ہے کہ جنگ نامہ کی طرح ان کی کوئی اور کارآمد تصنیف بھی ہو جو اب تک منظر عام پر نہ آسکی۔ لیکن اس وقت جو کچھ موجود ہے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ قاضی نور محمد گنج آبوی نے بلوچ قوم کی ہر طرح خدمت کی ہے' اگر ان کے دور میں بلوچی زبان تحریری طور پر رائج ہوتی تو شاید جنگ نامہ اور قاضی موصوف کی دیگر تصانیف بلوچی زبان میں ہوتیں۔ دراصل کسی خدمت کے موقعہ پر صرف یہ نہیں دیکھا جاتا کہ وہ کون ہے بلکہ یہ بھی دیکھا جاتا ہے کہ جذبہ اور کام میں کتنی شدت اور خلوص ہے اور قاضی نور محمد کے ہاں بلوچوں کے لئے خدمت کا جذبہ اور خلوص بدرجہ اتم موجود ہے' اور اس لئے ہم انہیں بلوچ شعراء وادباء کی صف میں شامل کرنے پر فخر محسوس کرتے ہیں۔

000

مُلّا بہرام

آج سے ساٹھ ستر سال پہلے مُلّا بہرام ایرانی بلوچستان میں سرباز کے علاقے میں زندہ سلامت تھے۔ مُلّا بہرآم کا کلام بھی دوسرے مشہور شاعروں کے کلام کی طرح زبان زد عام وخاص ہے، خصوصاً ادب دوست حضرات نے اس کی شاعری کی بہت تعریف کی ہے۔ مُلّا بہرام کا کلام اس کے بھتیجے مُلّا موسیٰ جو خود بھی اچھے شاعر تھے کی زبانی یہاں معلوم ہوا ہے، مُلّا بہرآم نے مختلف قسم کے اشعار کہے ہیں، رزمیہ، بزمیہ، تاریخی وصُوفیانہ، مختصر یہ کہ زندگی کے ہر پہلو کے متعلق اس نے طبع آزمائی کی ہے اور ہر طرح اس میں کامیاب رہا ہے۔

یہاں نموتاً مُلّا بہرآم کی ایک طویل نظم پیش کی جاتی ہے، جس میں رومان کے ساتھ ساتھ تصوف بھی ہے، رزمیہ شاعری بھی بڑی جاندار ہے، رحم علی مری، اور ملا فاضل کے بعد مُلّا بہرآم کی رزمیہ شاعری اپنے پورے کروفر کے ساتھ موجود ہے:

نمونہ کلام:

اوکپوت سبزیں طوطی گویاکیں
راگیں شاپی مرغ ھوستاکیں
وشگشین قمری چُست ءُ چالاکیں
ہنزکن بہ حکم ءِ گردگارِ پاکیں

برمنا بازار ے مبارکیں
صاجبی کوٹ ءَ ماڑیاں لکئیں
پرکہیب تھنگ لعل تخک زکئیں
کل ءِ خاتوناں دوست کسانکیں
وندی وتی بیکان شائینہ ءَ شکین
تری گوں دزگہارے کنیز کیں

O

زوری جانیگاں دزگھاریناں
روت منا کنڈان شیرہواریناں
شپی سربواں مسک ہواریناں
جنبش بہ زلفاں سیاہ ماریناں
دست مندریگاں ھشت ءَ چاریناں
کنجلانی عیناں خماریناں
کنل ءَ پوران گیر ءَ دانیاں
شوردئے شیدیان مزاریناں
چومنے مستاں بیقرار ییناں

O

گوں وتی دوستءَ جوانی ءَ سوال کنت
وشدلیں گپ دتیل ءَ قال کنت
موسماں دوریں ماہ ءَ سال کنت
پرمنی بالاد ءَ ھلال کنت

O

O

شرنبازینی او کپوت چاہی
ہنچو کہ ہیرونت نہار ماہی
واں سحر گاہی مئے وتئ دُراھی
ابجد ءُ بالاد ءِ برد برزا
چہ ہزار ءِ توک ءَ بگر دزّا
ھشت امیران مرکب ءَ سواواں
نہہ(۹) نغرءُ زداگاں گر ءُ داراں
پنج ءِ ہمائی رندپد ءَ چاراں
چارہما درستانی رکاب داراں
دست کہ ہمراہ نیت شرپہ داراں
گشتک ملایا مکرانی ءَ
ھشت ءُ نہہ چار ءُ پنج فلانی ءَ
کوتاہ کن ورنا شوق ءُ شانی ءَ
تومکن توصیف ورم گورانی ءَ
امروز آپ ءِ کہ روت تچانی ءَ
بندیت پیل ئے پشت پانی ءَ
مردم انت مُثل کارانی ءَ
صحب ءُ بیگاہ ءَ راہ روانی ءَ

O

ترجمہ:

طوطی کی طرح بولنے والے اے سبز کبوتر!
اے مرغ سلیمان کی طرح چست و چالاک پرندے!
اے خوش گفتار قمری کی طرح چست و سبک پرندے!
کردگار پاک کے حکم سے اُڑ جاؤ اور مجھے کوچہ مبارک میں لے
جاؤ جہاں بلند شاہی قلعے اور اُونچے محل میں،
جہاں وہ خوش لب ادائے محبوبانہ کے ساتھ براجمان ہے،
جو تمام حسینوں سے کم عمر ہے،
جو اپنی زلفوں کو خوبصورت کنگھی کے ساتھ سنوارتی ہے،
جو اپنی کنیز سہیلیوں کے ساتھ اٹھلاتی پھرتی ہے،
مجھے وہاں لے جا!
وہ جو اپنی جانی سہیلیوں کے ساتھ محل کے گوشے میں پھرتی ہے،
جو خوشبوؤں میں رچ بس کر اپنی سیاہ مار زلفوں کو سنوارتی ہے،
وہ جس کی خوبصورت حنائی انگلیوں میں بارہ انگوٹھیاں ہیں۔
جو اپنی خماری آنکھوں میں کاجل لگاتی ہے،
جس کی زلفوں کی کالی لٹیں شیدیوں (کالے حبشیوں) کی
طرح سیاہ، اور جو مجھ مست کی طرح بے قرار ہیں،
اے کبوتر! اپنے اور میرے دوست سے سوال کرو
اور بیٹھ کر اس سے مجلس کرو!
اور اپنی شیریں بیانی سے دُوریوں کو مٹا دو!
اے چاہی کبوتر! اس کے سامنے اس کی توصیف کر!

!-----------------

رات سے صبح تک اس کو محوِ گفتگو رکھ!

ذرا حروف ابجد کی طرف جاؤ' اور اس کا نام تلاش کرو!

ہزار کے بیچ میں سے چور کو پکڑو آٹھ امیر جو گھوڑوں پر سوار ہیں۔

نو لنگر گھوڑوں کی لگامیں تھامے ہوئے ہیں'

پانچ آدمی اُن کے پیچھے پیچھے چل رہے ہیں'

چار آدمی اُن کے رکاب کو پکڑے ہوئے ہیں'

یہ سب ساتھ چلیں تو کتنے اچھے لگتے ہیں"

اس مکرانی مولوی نے کہا' آٹھ نو چار پانچ فلانی سے!

کہ اے نوجوان اپنے شوق کو مختصر کر ان ہار پہننے والی حسینوں کی زیادہ تعریف مت کر'

کیونکہ یہ زندگی بہتے دریا کی مانند ہے اس چلتے ہوئے پانی کو کوئی ہاتھی بھی نہیں روک سکتا'

انسان کاروان کی مانند راہ میں ہے اور دن محوِ سفر ہے!

OOO

فقیر قیصر خان

بلوچی زُبان کا قادرالکلام شاعر

فقیر قیصر خان بلوچی اور براہوئی زبان کے قدیم شعراء میں سے ہیں' ہر موقع اور واقعہ پر فی البدیہہ شعر کہتے تھے' اس دور میں کوئی شاعر اتنا قادرالکلام نہیں گزرا۔

ضلع چاغی کے مشہور شہر نوشکی سے کچھ دور سرل سٹیشن کے قریب فقیر زئی قبیلہ کے لوگوں کی ایک چھوٹی سی بستی ہے' فقیر قیصر خان یہیں ایک غریب گھرانے میں پیدا ہوئے اور دنیائے شعروادب میں نام پاکر 1961ء میں نوے (90) برس کی عمر میں اسی بستی میں وفات پائی اور یہیں دفن ہوئے۔

فقیر قیصر خان کی شاعری میں حقیقت نگاری اور سوزوگداز ہے' اس کی شاعری اپنے دور کی صحیح عکاسی کرتی ہے' کیونکہ وہ جس واقع کا نقشہ کھینچتا ہے' اس میں ماحول اور نام تک گنواجاتا ہے اس سے نہ صرف اس واقعہ کی منظر نگاری اور تصدیق ہوتی ہے بلکہ ایک طرح اس دور کی تاریخی حیثیت کا تعین ہوجاتا ہے۔

نوشکی کے جناب حکیم خدائی رحم مینگل' جو قیصر خان کے دوست اور ہمعصر ہیں' ان کے توسط فقیر قیصر خان کی ایک واقعاتی نظم پیش کی جاتی ہے' جس میں شاعر نے ایک پورے واقعہ کو نظم کیا ہے' اس واقع کی تفصیل یوں ہے کہ کسی عثمان نامی چرواہے کو ایک امیر شخص شہہ سُہراب نے اس شرط پر اپنے ہاں کام پر رکھ لیا کہ جب اس کی لڑکی جوان ہوگئی' تو وہ اسے عثمان سے بیاہ دے گا' کئی سال بعد جب لڑکی جوان ہوگئی تو عثمان نے

شادی کا مطالبہ کیا' اس عرصے میں ایک مقامی سردار جمعہ خان لوہارزئی نے لڑکی کے حُسن سے متاثر ہوکر اس سے شادی پر آمادگی کا اظہار کیا' شبہ سہراب نے حامی تو بھر لی لیکن اس نے عثمان چرواہے کی رضامندی کے لئے سردار جمعہ خان کو صورتحال سے آگاہ کردیا' سردار نے عثمان کو بُلا کر اسے ہر شرط پر راضی کرنے کی کوشش کی' مال متاع کی پیشکش کی' اسے دوسری جگہ شادی کرانے کا عہد کیا لیکن عثمان کسی بات پر رضامند نہ ہوا' بالآخر سردار جمعہ خان نے اس لڑکی سے شادی رچالی' عثمان بیچارہ دیکھتا رہ گیا' اب اس کے لئے دنیا تاریک ہوگئی' ایک دن وہ فقیر قیصر خان کے ہاں پہنچا اسے تمام صورتحال سے آگاہ کرنے کے بعد التجا کی کہ آپ اس واقعہ کو نظم کریں تاکہ میں اُسے گنگنا کر دل کو تسلی دُوں' یہ گزارش عثمان نے کچھ اس لہجہ میں پیش کی کہ فقیر قیصر خان کو ترس آ گیا' اس نے وعدہ کیا کہ پہلے وہ اس لڑکی کو جا کر دیکھے گا اور پھر اس واقعہ کو نظم کرے گا' چنانچہ وہ عثمان کو اپنے گھر میں بٹھا کر اس لڑکی کو دیکھنے گیا' ایک فقیر شخص سے کسی کو کیا پردہ؟ چنانچہ اس نے لڑکی کو دیکھا اور اس کے حسن خداداد سے بے حد متاثر ہوا' گھر آ کر اس نے اس واقع اور اس حسینہ کے حسنِ خداداد کی تعریف میں ایک نظم کہی جسے عثمان نے بعد میں ازبر کرلیا اور پھر اس نے ساری زندگی گنگناتے ہوئے گزار دی۔

O

عثمان ءِ شیئر

کاران خُدائی شے بکند
چھو نہ گذی چار روش ءِ زند
وختی بلانوش خان ءِ جند
شہ حسن' تھوئے شیریں خُمار
عثمان ءَ عاشق پے دُوار
دوستاں منی نارو بیار

من دیسگوں وشئے اے جنگ
بیاتا جگیں شیر ءِ پترک
تہ ئن گوسابی ہم کنک
من نندین گوں تو ہمکنک
زاماس کھنیں عثمان تھرا
کار چئے لوہار زئی ءَ جتھا
جال شادلے بنداں شتا
پیرچون کنت سیاہین ہرا
حکم ءَ کھتیں چو نادرا
چیزے پتروس شہ قادرا
گوما پکن حق ءَ شرا
بڑتیں منی جوانیں جتا
خیرا مہ گندے شہ خدا
بیخت کشی شہ بنا
سلطان سخی سرور ءَ
شے ءِ جنک بے در در ءَ
حور ءَ پری پیداور ءَ
عثمان غریب تھئی ہمسر ءَ
طوق زیب دنت گھٹہ تئی
دور داتئے گرتے جئی
مچ بنت سر اتھی شہ زئی
جی سماعیل زندہ پیر

فریاد کھنت پیشئے فقیر
پُشت ءَ پناہ تھئی دستگیر

○

فقیر قیصر خان کے بے شمار اشعار اور نظمیں ہیں' ان میں سے زیادہ تر وہاں کے بعض لوگوں کو ازبر ہیں' فقیر موصوف کی چند مشہور نظموں کے عنوان یہ ہیں۔

پشتو ءِ شیئر' مُشک ءِ شیئر' گل خان ءِ شیئر' شہناز ءِ شیئر' علی دوست ءِ جنگی شیئر' (جو اپنی جگہ ایک مثنوی ہے) اور مڑتی ءِ شیئر' وغیرہ۔

فقیر قیصر خان' کی مندرج نظم ''عثمان ءِ شیئر'' کا ترجمہ یہاں پیش کیا جاتا ہے:

○

ترجمہ:

اللہ کا کیا ہُوا کام دیکھ!
یہ چار دن کی زندگی کس طرح گزرے گی'
اے پیر بلانوش' دستگیری کرو'
اے شیخ حسن تم ہی شیر ببر ہو'
عثمان تو ایک نامراد عاشق ہے'
میرے دوست کو نارو میں لاؤ''
میں نے شیخ کی لڑکی کو دیکھا ہے'
وہ پاک دامن' دودھ کی طرح صاف ستھری پاکیزہ ہے'
کاش میں اُس کے ہم پہلو ہو کر بیٹھوں!

اس کے باپ نے کہا تھا اے عثمان میں تمہیں
اپنا داماد بناؤں گا‘ لیکن افسوس کہ ایک ایسا خنجر
لوہارزئی نے بھونک دیا ہے‘
جوکہ دل کے ایک ایک جوڑ سے پار ہوگیا ہے‘
پیر کہا کرے گا‘ کالے گدھے کو!
حکم کروں گا‘ نادرشاہ کی طرح کچھ تو خداتعالیٰ
سے خوف کر ہمارے ساتھ حق وشریعت کے
پیمان کو پُورا کر!
تم میری بیوی کو اٹھا کر لے گئے ہو‘
اللہ تعالیٰ تمہیں نامُرادو ناکام رکھے!
تمہاری بیخ وبنیاد کو اکھاڑ پھینکے سلطان تخی سرور!
شیخ کی لڑکی بے مثل ولاثانی ہے حُور پری سے
زیادہ حسین ہے عثمان غریب تمہارا ہمعصر
اور ہمسر ہے‘
اے محبوبہ! تمہارے گلے میں چمکتا ہوا طوق اچھا
لگتا ہے سارے شیخ زئی تمہارے چاروں طرف
اکٹھے ہوں گے جی اسماعیل زندہ پیر!
تمہارے آگے یہ فقیر فریاد کرتا ہے‘
پشت پناہی کرو‘
اور دستگیری کرو!

OOO

فیصل فقیر

بلوچی، سندھی، فارسی زبان کا صوفی شاعر

فیض آل فقیر علاقہ کچھی کے ایک گاؤں کھاری کوناڑو کے رہنے والے تھے، ان کا نام فیض محمد تھا، فیصل تخلص کرتے تھے۔ لاشاری بلوچ تھے، انہوں نے چھ زبانوں میں شاعری کی ہے، سرائیکی، سندھی، بلوچی، براہوئی، فارسی اور اُردو۔ اُن کی شاعری کے دو قلمی دیوان محفوظ ہیں، ایک فارسی اور دُوسرا سندھی ہیں، سندھی دیوان میں بلوچی زبان کی کافیاں بھی شامل ہیں۔

فیصل فقیر عربی فارسی کے عالم تھے اور اپنے دور کے خدا رسیدہ اور کامل انسان تھے، بلوچستان کے مشہور فارسی گو شاعر جناب نواب گل محمد زیب مگسی کے ہمعصر اور دوست تھے، اکثر زیب مگسی انہیں اپنے ہاں لے جاتے اور عرصہ تک مہمان رکھتے۔

فیصل فقیر کا آبائی پیشہ زمینداری تھا، چونکہ یہ علاقہ خشکابہ ہے، اس لئے مال مویشی کا کاروبار بھی کرتے تھے، کچھ عرصے بعد انہیں حصول طریقت کا شوق پیدا ہوا، اپنے علاقے کی مشہور بزرگ شخصیت حضرت میاں رکھیل شاہؒ مرحوم صوفی القادری کی خدمت میں فتح پور میں حاضر ہوئے اور ان کے حلقہ ارادت میں شامل ہو گئے، مُرشد کے ارشاد کے مطابق یہاں درس و تدریس کا سلسلہ جاری کیا، اور حضرت رکھیل شاہؒ کے دور تک یہ سلسلہ جاری رہا، خرقہ خلافت حاصل کرنے کے بعد وہ اپنے وطن چلے گئے۔

فیصل فقیر کے سوانح نگار جناب پیر محمد زیرانی بلوچ ان کی شخصیت کا ذکر کرتے ہوئے ایک مضمون میں لکھتے ہیں، کہ فیصل فقیر مُرشد سے خرقہ و دستار حاصل کرنے کے بعد نواب شاہ سندھ کی طرف روانہ ہوئے راستے میں کچھ معتقدین مل گئے، انہیں مجبور کیا کہ ان کے ہاں چل کر رہیں، چنانچہ فقیر موصوف وہاں چلے گئے، بعد میں وہ انہیں ایک

ایک ویران بستی میں لے گئے جو "جنوں کی بستی" کہلاتی تھی فقیر فیضل سے گزارش کی گئی کہ وہ اس اجڑی ہوئی بستی کو آباد کریں چنانچہ انھوں نے اس بستی کو آباد کرنے کا تہیہ کر لیا اور وہیں رہ گئے ان کے دم سے یہ بستی آباد ہو گئی اور لوگ یہاں رہنے بسنے لگے معتقدین نے بستی کا نام فیضل فقیر کی نسبت سے فیض پور رکھا اور آج تک اسی نام سے مشہور ہے۔

فیضل فقیر شرع کے پابند اور صاحب کشف تھے 74 سال کی عمر میں وفات پائی عرصے سے علیل تھے ایک دن صبح کی نماز کی ادائیگی کی حالت میں جان، جان آفرین کے سپرد کر دی اور اپنے مولا سے جا ملے!

○

بلوچی کافی

نمونہ کلام ..... فیضل فقیر

بیا بیا کہ پڑتہ دلبرول بیت منی دیوانہ
جند جان ءُ ساہ قربان پڑتہ منی آوجانا
دال دال کہ تھونہ کھائے من نشتغاں براگی
گندان راہ گریان کھائے تہ کھد نہ زانا
دل گپتغاں آکیراں چیچے من کپتہ چیچی
شف روچ عشق آسا، بے آف، بے نغانا
پھوتھرا من پھولاں ہندن تھتی بے دا
وت ڈستھے گوں رازا مارا کھدن مکانا
فیضل دے دا کھنءُ من من تحن کہ محبوب
وت پر وڈیں دتہ را بل گھل ڈوی گمانا

○

ترجمہ:۔

آ! اے دلبر کہ دل تیرا دیوانہ ہے
مال و سر قُربان ہے تُجھ پر اے میرے
محبوب!
جب تک تو نہ آئے گا، میں اداس ہی بیٹھا
رہوں گا
میں تمہارا راستہ تکتے تکتے روتا ہُوں مَیں
نہیں جانتا کہ تو کب آئے گا!
دل کو جدائی کی موجوں نے گھیرا ہے
اس کی وجہ سے بل پر بل پڑ گئے ہیں
دن رات عشق کی آگ میں بغیر کھائے
پیئے پڑا ہُوں
میں تجھے کہاں تلاش کروں تیری جگہ
تو یہاں پر ہے
حالانکہ تو نے خود ہی اپنے راز کو بتایا ہے
کہ میں لامکان ہُوں!
فیصلؔ کچھ دیر خاموش رہ، خود نمائی نہ کر
کہ محبُوب خود اپنا پردہ آپ ہے

ooo

جُواں سال

بلوچی زبان کا قدیم ادب زیادہ تر طویل رزمیہ قصے کہانیوں اور رومانی نظموں پر مشتمل ہے اور یہی وجہ ہے کہ اس کی کلاسیکی شاعری کا انحصار انہی طویل رزمیہ قصے اور رومانی نظموں پر ہے' اسی لئے بلوچی زبان میں تعمیری اَدب کی تشنگی سی پائی جاتی ہے۔ اور اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ بلوچوں کا کلچر اور فطری ماحول ایسا رہا ہے کہ ان کے قبائلی تنازعات اور رنجشوں اور رقابتوں نے رزمیہ شعری ادب کو جنم دیا۔ بعد میں حالات کی سازگاری اور میل وملاپ کی مناسبت نے رومانی ادب کی تخلیق کی' اسی لئے تعمیری وافادی ادب جس سے قوم کے افراد کی اخلاقی اصلاح وتعمیر مقصود ہوتا ہے' بلوچی زبان میں پیدا نہ ہوسکا' ہوسکتا ہے کہ انفرادی طور پر کبھی کوئی کوشش کی گئی ہو۔ لیکن وہ اس قدر نہ تھا کہ ہم اسے تعمیری ادب کا سرمایہ قرار دے سکیں اب اس کا سہرا بلوچ قبائل کے ایک دیہاتی شاعر جُواں سال کے سر ہے جس نے اپنی غربت اور کم مائگی کے باوجود بلوچی زبان کے دامن کو تعمیری وافادی ادب کے سرمایہ سے مالا مال کردیا ہے۔

جواں سال' جس کی طبعی زندگی اپنا شباب کھو چکی ایک گاؤں میں گمنامی وغربت کی زندگی بسر کرتا رہا' وہ جب ضعیف اور عمر رسیدہ ہونے کی وجہ سے بے حد مفلس ہوگیا اپنے اور افلاس کی کیفیت ایک شعر میں یوں بیان کرتا ہے:

وختے استین وختے تنگ

وختے پاژنت وختے لنگ

"کسی وقت، کبھی ہے اور کبھی تنگ دستی
ہے، کبھی ہستی، تو کبھی عیشی، کسی وقت
پاؤں سلامت ہیں اور کبھی لنگڑا ہوں"۔

افلاس کی اس سے زیادہ واضح اور صحیح تصویر کشی مشکل ہے، جو اس سال کی یہ
سب سے بڑی خوبی ہے، کہ وہ ہر واقعہ اور احساس وجذبات کی صاف اور صحیح تصویر پیش
کرتا ہے، اور یہ اس لئے کہ وہ عوامی شاعر ہے، اپنے عوام کے دکھ درد اور مصیبتوں سے
بخوبی آگاہ ہے، ان کے جذبات واحساسات کو اچھی طرح سمجھتا ہے ان کی زندگی کا
سچا ترجمان ہے، اس لئے وہ اپنے اشعار میں جہاں ان کے دکھ درد کو پیش کرتا ہے، وہاں
ساتھ ہی انہیں ملامت بھی کرتا ہے، اور بتاتا ہے کہ وہ کیوں ذلیل وخوار ہیں، ایسی ایک
طویل نظم کے چند اشعار یہاں پیش کئے جاتے ہیں۔

رب چندی ڈیٹھاں دُکھی ویلانی
گاڈاں بھر شاں ریلانی!
جھنڑ کاٹ، سنگھرء زیلانی
داہاں بنگلیں بیلانی
اے بندا! کڑداراں شے فیلانی
فیلؤ گندغین حیلانی!

"اے رب تعالیٰ! میں نے بے شمار دکھی انسان دیکھے ہیں،
جیسے ریل کے ڈبے مسافروں سے بھرے ہوئے ہوتے ہیں!
وہ دکھی لوگ دکھ کی پردرد چھنکتی ہوئی زنجیروں میں جکڑے ہوئے ہیں، اور مصیبتوں کے
جولانوں کی جھنکار بھی ساتھ ساتھ سنائی دیتی ہے۔
اے انسانو! یہ سب تمہارے کرتوتوں کا نتیجہ ہے!

تمہاری بُری عادتوں اور افعالِ بد کا ثمرہ ہے!!

تعمیری ادب جسے ہم اصلاحی اور افادی ادب بھی کہتے ہیں' چونکہ ایک مقصدی ادب ہوتا ہے' اس لئے اس کا موضوع فرد کی زندگی کے بجائے اجتماعی زندگی رہا ہے' اور یوں بھی ہر افادی اور مقصدی ادب کی یہ بنیادی خصوصیت ہے کہ وہ اپنے دور کی اجتماعی زندگی سے ایک گہرا اور براہِ راست تعلق رکھتا ہے' اس لئے اس کی تخلیق ایک مخصوص نظریہ اور سماجی مقصد کے ماتحت عمل میں آتی ہے۔

قدیم بلوچی ادب میں تعمیری اور مقصدی ادب کی بے حد کمی ہے اور زیادہ تر رزمیہ اور رومانی ادب کی تخلیقات ملتی ہیں' جن میں جنگ وجدل کے واقعات اور عشق ومعاشقہ کی رومانی کہانیوں کے علاوہ اور کچھ بھی نہیں' بعض شعراء نے مذہبی عقائد کی پختگی اور دینی امور کی تلقین سے متعلق کچھ اشعار اور نظمیں کہی ہیں' لیکن وہ اس قدر نہیں کہ اسے مقصدی اور تعمیری ادب کا گراں قدر سرمایہ کہا جاسکے وہ جو کچھ بھی ہو صرف تعمیری ادب نہیں کیونکہ تعمیری ادب تو سماجی واجتماعی زندگی کے ہر شعبہ کی ترجمانی کرتا ہے' وہ زندگی کا ترجمان بھی ہے' اور خلاق بھی۔

بلوچی زبان میں تعمیری ومقصدی ادب پیش کرنے کے بارے میں جُوان سال کی کاوشیں قابل داد ہیں' اس کی اکثر نظمیں تعمیری ادب کا شاہکار ہیں' اس کی بعض بلوچی نظمیں اور غزلیں ریڈیو پاکستان کوئٹہ سے بھی نشر ہوچکی ہے' مجموعہ کلام غیر مطبوعہ حالت میں موجود ہے' غربت کی وجہ سے طباعت کی نوبت ہی نہیں آئی' اس کا کلام زیادہ تر مقامی لوگوں کو ازبر ہے' اور انہی کے ذریعے وہ ادب نواز حلقوں تک پہنچتا ہے'

جُوان سال کی ایک طویل نظم جس میں عام باتوں کے علاوہ انسان کی بعض کیفیات کا ذکر بھی ہے یہاں اس کا ایک بند پیش کیا جاتا ہے' جس میں تعمیری ادب کی

مَے چھما دیخاں رَب بازیں رنگ

وخت ءِ خیر ینو وخت ءِ جنگ

وخت ءِ کھلاں درشاں درنگ

وخت ءِ ساہیں ماٹت ءِ تنگ

مرد ءَ جواں نیئیں؟ لوغ ءِ جنگ

مرد ءَ وہار کھنت سیاہیں ننگ

O

ترجمہ:۔

اے رب! ہماری آنکھوں نے تیری قدرت کے
بہت سے رنگ (تماشے) دیکھے ہیں!
کبھی امن وامان ہے کبھی لڑائی فساد برپا ہے'
کبھی تو انسان اپنی للکار سے پہاڑوں کے دل
دہلا دیتا ہے'
اور کبھی اس کی اپنی یہ حالت ہوتی ہے کہ اس کی
جان جسم سے نکلنے کو بیقرار ہے اور دم گلے میں
اٹکا ہوا ہے'
مرد کے لئے گھر کی لڑائی اور جھگڑا ٹھیک نہیں ہے'
مرد کو بُری اور لڑاکا عورت ذلیل وخوار کرتی ہے'

اسی نظم میں آگے چل کر وہ اپنے موجودہ دور کے نوجوانوں کی حالت بیان کرتا ہے اس حصہ نظم میں یہ ایک ایسا بند ہے' جس میں بھرپور طنز بھی ہے اور فنکارانہ صداقت بھی!

مڑداں' لڈثو' سند ءَ بَر
ماث خوشاں ءَ بچھاں ژَر
پیدا ایتغاں گُل پُوتیں چَر
ھینگاں کھناں چوسیاہیں کھر
ژرص ءَ داثغاں گوخ ءِ گر
بیاپاڑ ءَ پَٹّش تہ پیغمبر!

O

ترجمہ:۔

افسوس کہ مرد چلے گئے ہیں اور ان کی جگہیں
ویران پڑی ہیں'
مائیں خوش ہیں کہ ہمارے بچے اب پورے
جوان ہو گئے ہیں'
حالانکہ یہ پیدائشی بے وقوف اور جاہل ہیں'
یہ کالے گدھوں کی طرح رینگتے رہتے ہیں'
یہ نفسانی حرص کے کوڑھ میں مبتلا ہیں'
آ! اے پیغمبر ﷺ تو ان کی بنیاد کو ختم کر!

O

جواں سال' شاعر کے علاوہ اپنے معاشرہ کا ایک فرد بھی ہے' جس معاشرہ میں جہالت اور عزیت کا دوردورہ ہے' وہ اس حالت سے کیسے بیگانہ رہ سکتا ہے' چنانچہ وہ اپنے مخصوص انداز میں معاشرہ کے عام لوگوں سے مخاطب ہوتا ہے:

نیں بیاء رب ء راکھن آر واس ء
گار باڈوڈلی گوناس ء!
دفارا گندغین یُوہڑاس ء
حقہ سوہویں و آس ء
کھلیں نی شف ء ے پاس ء
آں مرڈکہ معصومی وحیا پھیراں
جوانی ء دیاں تقریراں!
ہمابانی خدمت ء حوراں!!

O

ترجمہ:۔

آؤ! اللہ تعالیٰ سے عرض کریں،
کہ نسوار کو ڈبیہ سمیت گم کردے اس کے استعمال
سے منہ سے بدبو کے بھبکے اڑتے ہیں،
حقہ سراسر آگ ہے!
جو رات کے پچھلے پہر، کھانسی لاتا ہے،
جو لوگ بچپن سے بڑھاپے تک بوڑھے یعنی نیک
رہتے ہیں،
خدا تعالیٰ کی عبادت اچھی طرح کرتے ہیں،
ان کی خدمت کے لئے حوریں ہیں!!

O

تعمیری اور مقصدی ادب کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہوتی ہے کہ وہ مقصدی
ہونے کے باوجود فن کی اعلیٰ اقدار کی تکمیل کرتے ہوئے فنی معیار پر پورا اترتا ہے اسی
لئے مقصدی ادب میں مقصد کو براہِ راست پیش کرنے کے بجائے اشارات وکنایات
سے کام لیا جاتا ہے' جواں سال کو بھی اپنے مقصد (اصلاح وتعمیر) کو پیش کرنے کیلئے
جہاں براہِ راست مخاطب ہونے کی کوشش کی ہے' وہاں اشارے وکنایے سے بھی اپنے
مقصد کو پیش کیا ہے' اس کی بیشتر نظموں میں اس کی مثال موجود ہے۔

یہاں ایسے چند اشعار پیش کئے جاتے ہیں' جن میں فن بھی ہے اور مقصد بھی:

وارے مرکباں سینگھاراں
تھئی مڑو شمارا نازیناں
براں دیمی منزلاں گوازیناں

o

دیما استن ءِ تھئی ڈاہے
دستان ءَ جنے پرساہ ءِ
پیداشہ نہ بیت ءِ یک پاءِ
گڑگھنغانہ بیث ءِ راہے

o

ترجمہ:

لکڑی کے ٹکڑوں کو جمع کر کے (مالکی کے لئے)
سنوارتے ہیں'
اور پھر لوگ نہلاتے اور دھلاتے ہیں' اس کے

بعد آئندہ منزل پر لے جا کر چھوڑ دیتے ہیں،
آگے پھر ایک اور سلسلہ ہے وہاں افسوس سے
ہاتھ ملوگے،
وہاں ایک چونی بھی نہ لاسکوگے اور نہ کہیں
بھاگنے کو راستہ پاسکوگے،

o

شیہاں ژُرتھغاں شیطان
آف ءِ رتکغان تاوانی
لوغاں تہ نہ یان گدرانی

o

کورو ءِ کھننین یاری ءِ
کورؤ جامعہ ءِ تینگھاری
دست ءِ گیڑتھ مہ میت کھاری
جوائیں پیشغاں شوں واری

o

ترجمہ:۔

شیہوں نے !(بیماروں کے سامنے مکاری سے
سر دو پر سر مارنے والے)! شیطانی راہ اختیار
کر رکھی ہے ان کا تو پانی بھی تاوان (حرام)
ہے۔

وہ حرام کھاتے ہیں اور گھروں میں نہیں رہتے!
کوزہ کے ساتھ دوستی کرو!
کوزہ جسم وجان کو پاک کرتا ہے'
اور ہاتھ سے پکڑ کر (عبادت گاہ) مسجد میں لاتا
ہے'
یہ اچھے دینی پیشے دکھائے گا!!

O

دنیا کا ہر ادب ایک مخصوص رجحان کا حامل ہوتا ہے' اور کسی ایک دبستان خیال کی تبلیغ کرتا ہے' لیکن اس کے باوجود اصل چیز ادیب کا تخیل ہے جس کا عمل اور تصرف' خیالات اور تخلیق میں ہوتا ہے' اس لئے اندازِ بیان میں دلآ ویزی اور اثر انگیزی کی خصوصیتیں پیدا کرنا جو ادب کی جان اور جوہر ہیں' ادیب کی بلند خیالی اور مدرت کی مرہون منت ہیں اور اس کے لئے ضروری ہے کہ ادیب اپنے مقصدی نظریہ کے ساتھ ساتھ صناعتی محاسن کو بھی نظر انداز نہ کرے اپنے فن کے نازک اور پیچیدہ رموز سے آگاہی حاصل کرنا چاہئے۔

جواں سال جو ہیوِ دانی بگٹی قبیلہ کا فرد ہے وہ ایک عوامی شاعر کی حیثیت سے اپنے علاقے کے عوام بلکہ تمام بلوچ قبائل کے حالات وخیالات سے پورے طور پر آگاہ ہے' وہ اپنے مقصدی نظریہ کے تحت جہاں تعمیری ادب کے ذریعے اپنے افکار وازکار کو پیش کرتا ہے وہاں ساتھ ہی وہ فن کی جن باریکیوں کو بھی کام میں لاتا ہے۔ جن سے انسانی جذبات وخیالات متاثر ہوتے ہیں' اس کے ہاں ایسے شاہکاروں کی کمی نہیں ہے' اسے فن پر پورا عبور حاصل ہے' اس کے تعمیری ادب کا ایک شہ پارہ یہاں پیش کیا جاتا ہے۔ اس میں بظاہر وہ صرف یہ کہنا چاہتا ہے' کہ '' حیا لوگوں سے چلی گئی ہے' اس لئے وہ

جائز و ناجائز میں فرق نہیں کرتے اور حرام کھا کر موٹے ہو گئے ہیں'' لیکن اس بات کو جواں سال نے جس فنکارانہ طریقے سے پیش کیا ہے' وہ اس کا حصہ ہے' بلوچی ادب میں اس کی مثال شاید مشکل ہی سے مل سکے گی۔

حَیا ما لڈ ثو بیث ءَ روانہ'
نی چیڑوئیں مڑدماں جراں مہ جان ءَ
حَیا' لڈ ثوبیث ءَ شف پندھ
صبوح ءَ زڑتھ ءَ شرم و شبا رند
شُتو وتی سنگت ءَ بیث' ءَ یہ ہند

گشے

ہمیں سن ءَ راکھفی بن!
حرام وارتھو جیشں چھوکونہ ئی گن!!

O

ترجمہ:۔

حیا' اپنا زختِ سفر باندھ کر چلی گئی ہے'
اب صرف کپڑے ہی آدمیوں کے جسموں پر رہ گئے ہیں!
حیا' رات کی تاریکی میں اپنا زختِ سفر سمیٹ کر پا پیدل روانہ ہوگئی'
صبح ہوئی تو شرم اور شعور اس کا سراغ لیکر روانہ ہوئے'
بالآخر انہوں نے اپنے ساتھی حیاء کو پالیا اور انہوں نے اسے کہا کہ اب ہم بھی نہیں جاتے' اس دور کو آگ لگے لوگ حرام کھا کھا کر سانڈ کی طرح موٹے ہو گئے ہیں!!

آج کل بلوچی ادب میں نئے اصلاحی وانقلابی رجحانات داخل ہورہے ہیں' مگر بلوچی زبان کے بیشتر ترقی پسند اور انقلابی ادیب محض اصلاحی' روحانی ادب پیش کررہے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ ان کی تخلیقات ہماری اجتماعی زندگی کی ترجمانی بھی کرتی ہے' لیکن اگر ان کی تحریروں کا جائزہ لیا جائے تو یہ بات نہایت ہی آسانی سے معلوم ہوجائے گی کہ وہ اجتماعی زندگی کے مسائل کو عوام کے انقلابی واصلاحی نقطہ نظر کے بجائے متوسط اور خوشحال طبقے کے محض اصلاحی اور جذباتی زاویہ نگاہ سے دیکھنے کے عادی ہو چکے ہیں۔ لیکن جواں سال کے ہاں یہ بات نہیں اس لئے وہ اپنے تعمیری نقطہ نظر کے باعث' بلوچی زبان کے ادیبوں اور شاعروں سے جداگانہ حیثیت رکھتا ہے' اس کے تعمیری نظریہ کی بناء پر اگر ہم اسے بلوچی زبان کا سعدیؔ کہیں تو بے جا نہ ہوگا' کیونکہ اس کے کلام کا بیشتر حصہ تعمیری ادب سے متعلق پندونصائح پر مشتمل ہے اور انسانی جذبات وخیالات کی صحیح ترجمانی بھی کرتا ہے' بلوچی زبان کا یہ عظیم متفکر وشاعر ''جوانسالؔ'' طویل عمر پاکر عزت وافلاس کی حالت میں 1966ء میں اپنے آبائی گاؤں میں فوت ہوا۔

O

پندء جواں سال

نمونہ کلام..... جواں سال

سلطان تئی مَیں شاہ ء
نام انت تھئی ملک ء شر
شیریں لب ء لفظ شکر
کاہے کہیب گل ء گر
پرگوارگ ء بستہ نگر
اے رچنت لال ء جوہر

چٹ کپتنت گل ءِ گوہر
انگلینکنت ہر دو نظر
گوں گندگاں بیتہ اثر
قربان کھتوں اے ساہ ءِ سَر

O

(نی)سر کپتگاں راہ ءَ دگر
مرداں نہ انت مردءِ قدر
دورءَ نہ انت کسے ءِ گزر
زورءَ نہ انت ترس ءِ تہر
بشک ءِ رانہ ئیں بہا ءِ جر
عشق ءِ رانہ ئیں جان ءِ حبر
مست ءِ مواس ءِ چشم ءِ تر
پُچی ءِ چریت در پہ در
جوشہ ءِ رابیت روح ءِ کڑ
ہوش ءِ بیت کل ءِ ہنر
بخت ءِ نہ نیت لوگ ءِ کسر
ہال ءِ مقیمی جان ءِ پَر
بے مال ءِ نیلیت مرض دگر
سیب ءِ نہ انت پیریں گگر

O

کوڑی تھئی گونڈ انت حبر
نزدیک انت تھئی پاد ءُ سگر
نیم زیر انت، نیمانت زبَر
ساراں تھئی جان ءُ جگر
نیم مادر ءُ نیم انت پدر
نیم شاہیں ءُ نیم انت فقر
نیم پیریں ءُ نیم انت؟
نیم گُل نو نیم انت بھونر
یک ءَ نہ بیت کسے قدر
دل کہ گشیت اکن پہ حشر
نفس ءِ راہ ءَ ہرگز نہ کِر
ہڑنلیت ءُ لوٹیت مادہ خَر
سیر ءِ پھدا تام ءَ مہ ور
ریم ءَ پس ءِ ڈول ءَ مَچر
دست ءَ دری حد ءَ مبر
بے باوریں ھذا مستر
چم دیتگیں کون ءَ مپر
لوغ ءِ درا جوان نئیں کنَر
(نوا) اٹکیت ءُ ایربیت بھاگ ءُ حبَر

o

شیطان ءِ شرّاں واڑتہ سَر
ھَفنی ءَ جزیت دست ءَ گور
تیزیت و کنت راھان بِگَر
چھے انت سری روچ ءِ امر
چھے تھوگُھتہ پیش ءَ حبَر
چھ انت تھئی زند ءِ ثمر
چھے زرتگے سائے ءِ شمر
دیر منزل و دراجیں سفر
بروئے کہ گوں بیت چند ءِ زر
ہر کوکرے دیلی گُذر
آخر کہ تھئی ھند انت قبر
کنڈے بلگائیں آس ءِ حبر
تڑکیت جھُووانی جگر
آں کافری سیاہیں سگر
بلاں تہ ناراں کوئیں ءِ گر

o

O

پاکیں خُدا ؏ پیغمبر
منظور کیتھین تھئی دین ؏ در
شافی بیت خیر ؏ بشر
محکم کھتہ بستہ کمر
وت پہ سرا رنداں فکر
سوہنڑاں بہشتی باغ ؏ بر
ہورسہنڑاں شہد ؏ شکر
یک مومن ؏ حور انت ستر
جوانساں تھرا باتاں احمر
جی کلمو ؏ وشیں حمر

O

ترجمہ:۔

اے بادشاہ! اے سخی، اے بلند مرتبت،
تیرا نام پُوری کائنات کو ہالہ کیے ہوئے ہے!
اے کہ تو شیریں دہن ہے، تیرے الفاظ قند کی
طرح میٹھے ہیں۔
اے خوش گفتار، خوش رفتار، تیرا حُسنِ گفتگو
کیا کہیے، جیسے بارش سے بوندوں کی
موسیقی ہو، اور زریں خیالات اور قیمتی

مضامین پھوار کے مانند ہیں۔

میری نظر ان پر پڑی اور مجھ پر اس دید
کا فوری اثر ہُوا۔ نتیجتاً میں نے اپنا سب
کچھ اس پر قربان کر دیا۔

اور اب مَیں نے ایک نیا راستہ اختیار
کیا ہے۔ مَیں سوچتا ہُوں کہ اس دنیا میں جبکہ
انسان کو انسان کی قدر و منزلت کا احساس
نہیں ہے۔

زمانے کو کسی کی ضرورت کی پرواہ نہیں
طاقت کے سامنے خون کی کوئی حیثیت
نہیں، انصاف اور بخشش اور لطف
و کرم کا کسی کو بھی ادراک نہیں ہے۔

عشق جسم کی اہمیت سے بے نیاز ہے
دیوانہ اور چشم تر رہتا ہے، اور آگ کی
طرح اندر ہی اندر سلگتا رہتا ہے۔

جذبات کو روح کا ادراک ہوتا ہے۔

فہم کو سب سے آگاہ ہونا چاہئے، مُقدّر جس
کے لئے مہربان ہو، یقیناً زندگی اس کے
ساتھ ہے۔

دولت جسم کے لئے بال و پر کی مانند ہے
غریب اور بے کسوں کی بیماری اور

مرض ناگزیر ہیں۔
بوڑھا اور ضعیف وبالِ جان ہوتا ہے
اے فانی دنیا تیری بات مختصر ہے۔
تیرا سر اور پیر سمٹ کر ایک ہو گئے
ہیں، اے فانی دُنیا تیرا نصف زیر ہے
اور نصف زَبر ہے۔
تیرے جان اور جگر برہنہ ہیں ظاہر ہیں
تجھ میں نصف مائیں ہیں اور نصف
باپ آدھے بادشاہ ہیں اور آدھے غُلام
آدھے بُوڑھے ہیں اور آدھے فقیر آدھے
پھول ہیں اور آدھے بھنورے، ایک جیسی
سب کی قدر و منزلت نہیں جو دل کہے
اس پر شدت سے عمل کر مگر نفس اور ہوس
کی راہ سے گریز کر کیونکہ یہ (دنیا) ایک
مادہ خر کی طرح ہینگتی ہے۔
تو حد سے تجاوز نہ کر (کیونکہ نفس امارہ
انسان کو کفالت سے زیادہ حصول پر
اُکساتا ہے)
چوپائے کی طرح گھاس پر نہ پل پڑ،
ہاتھ کی رسائی سے اُمید ہوس کا پابند
نہ ہو۔

ناقابل اعتبار حدود میں قدم نہ رکھ،
دیدہ ودانستہ طور پر قعرِ مذلت
میں نہ پڑ،
گھر کے بالکل دروازہ پر گز (کا درخت)
مناسب نہیں کیا معلوم کب یہ تمہاری
پگڑی سے اٹک جائے!
شیطان کے غلبے نے انسان کے وجود
کو نابُود کر دیا ہے۔
یہ انسان کے دوش بدوش ایسے چلتا
رہتا ہے، کہ بے خبری میں گمراہ کر کے
بھٹکا دیتا ہے۔
اے انسان! تجھے وہ وعدہ یاد ہے
روز ازل کا پیمان یاد ہے؟ جو خُدا سے
کیا تھا، تیری زندگی کی بساط کیا ہے؟
تیرے پاس راستے کے سفر کے لئے کیا
توشہ ہے!
منزل دُور ہے اور سفر لمبا ہے۔
چلو لیکن اپنے ساتھ اپنا سرمایہ پونجی
بھی ساتھ لے چلو،
اس سرائے میں جو کچھ کیا جاتا ہے کر
کے گزرا جاتا ہے۔

آخرکار تجھے مرنا ہے، تیرا آخری مقام
(قیام گاہ) قبر ہے، کسی گوشے میں آگ
کے شعلے اُبل رہے ہیں۔
جہاں کافروں کے سینے سُلگ رہے ہیں
یہ بدعمل اور سیاہ رو ہیں۔ اچھا ہی ہے کہ
یہ قعرِ مذلت میں پڑے ہیں۔
خداوند پاک اور اس کے پیغمبر نے تیرے
لئے دین کا راستہ متعین کردیا ہے۔
خیر البشر ﷺ سب (مسلمانوں)
کی شفاعت کریں گے۔
ہم تیار اور کمر بستہ ہیں۔ وہ سب کے
راہبر سب سے آگے ہیں اور پیچھے مومنوں
کا انبوہ ہے۔ بہشت کے باغوں کے میوے
پک گئے ہیں۔
وہاں آب کوثر ہے، شہد اور شکر ہے،
ایک مومن اور اس کی ستر خدمتگار حُوریں، اے
جوانسال!
خدا کرے کہ تجھے اجرِ عظیم ملے،
کلمہ پاک کے الفاظ کتنے اچھے اور شیریں ہیں

جوانسالؔ

000

بلوچی اکیڈمی ءِ لہتیں نوک چھاپ بوتگیں کتاب

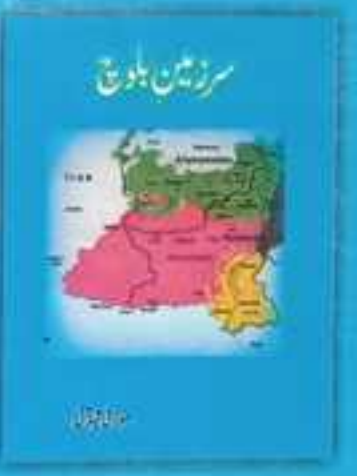

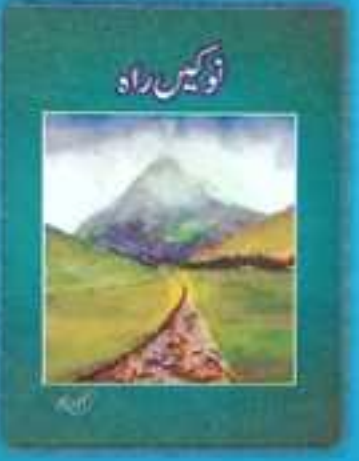

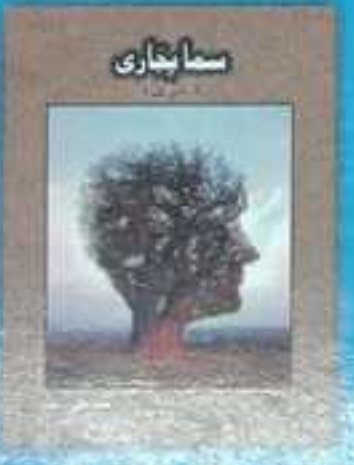

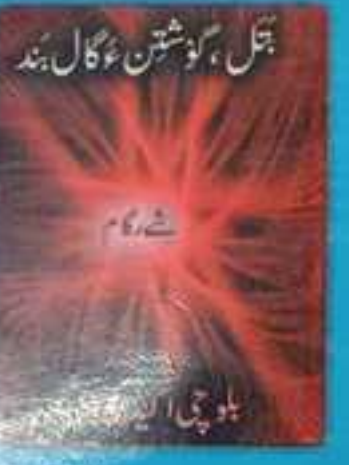

بلوچی اکیڈمی کوئٹہ

ISBN : 978-969-9768-02-6